L. No.7243 Phone, 8080

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1975

سرمایہ داروں کو وارننگ

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے سیشن میں قائد اعظم کا خطبہ)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ، لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

شاہکارِ رسالت

عمر فاروقؓ

(اپنے انداز کی منفرد کتاب)

اکثر سوالات ابھرتے ہیں کہ:-

- اسلام کا معاشرتی، تمدنی، عسکری، سیاسی، معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ ـــــ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:-

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکرِ قرآن جناب **پرویز** کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوشوں اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

- نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ، مضبوط جلد، جاذبِ نگاہ گرد پوش۔

قیمت:- 45/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
پاکستان سالانہ ــــ پندرہ روپے غیر ممالک سالانہ ــــ ڈیڑھ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	(۱½) ڈیڑھ روپیہ
جلد (۲۸)	جون۔ سنہ ۱۹۷۵ء	نمبر (۶)

فہرست

(۱) لمعات ـــــــــــــ ۲

(۲) باب المراسلات۔ (یہ ایک نفسیاتی مرض ہے) (ملّا کی ایک اور قبیح حرکت) (کشف و الہام) (حجِ بدل) ـــــــــــــ ۱۲

(۳) حقائق و عبر۔ (باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی) (سود حرام اور سود حلال) (ایک اور فیصلہ) (یہ بھی اسلام وہ بھی اسلام) (انانیت کے کرشمے) (ضیا کرسی میں کیا ہوگا) ـــــــــــــ ۱۹

(۴) نقد و نظر ـــــــــــــ ۲۷

(۵) فرقہ اہل قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا تجزیہ۔ (محترم پرویز صاحب) ۴۴ - ۳۳

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس۔ ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یوں تو اس اٹھائیس سال کے عرصہ میں وہ کونسا دور تھا جس میں پاکستان کی حالت ابتر نہیں ہوئی تھی لیکن جس قسم کی تباہی موجودہ عہد میں نمودار ہوئی ہے اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ یہ اس سیلاب کی طرح آئی ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ ظھر الفساد فی البر والبحر۔ خشکی اور تری سب میں فساد پھیل گیا۔ زمین کا کوئی گوشہ، کوئی کھنڈر ایسا نہ رہا جس تک اس طوفان کی تلاطم خیزیاں نہ پہنچ چکی ہوں۔ اس میں قانون و ضوابط خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ہیں۔ اخلاقی اقدار کا ریگ ساحل تک پر بھی نشان باقی نہیں رہا۔ شرف و مجد انسانیت اس طرح غرق ہو گئے ہیں کہ نہ ان کا کہیں جنازہ اٹھا ہے نہ مزار تعمیر ہوا۔ جس طرح سیلاب بے پناہ کے سامنے نہ مسجد باقی رہتی ہے نہ مندر۔ نہ گھر محفوظ رہتا ہے نہ بازار۔ نہ حیوان زندہ رہتے ہیں نہ انسان۔ نہ آبادیاں نظر آتی ہیں نہ ان کی طرف جانے والے راستے۔ وہی حالت اس بدنصیب ملک کی ہو گئی ہے۔ جو بچے کھچے شریف انسان ان تباہیوں کے بھنور میں پھنس گئے ہیں، انہیں غنڈہ گردی کے نہنگ (مگرمچھ) زندہ نگل لینے کے لئے چاروں طرف سے ہجوم کر کے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ جو لاچار پناہ لینے کے لئے درختوں پر چڑھ گئے ہیں، بدقماشی کے اژدہا ڈسنے کے لئے ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ غرضیکہ عزت و آبرو کے خواہاں شریف انسانوں پر (قرآن کے الفاظ میں) زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہو چکی ہے۔ اور وہ کہیں پناہ نہیں پا رہے۔ نہ عورتیں گھروں میں محفوظ ہیں، نہ بچیاں درسگاہوں میں مامون۔ نہ مسافروں کو بے خوف و خطر گھر لوٹ آنے کی امید ہوتی ہے نہ گھروں میں سونے والوں کو صحیح سلامت جاگ اٹھنے کی توقع۔ اس انداز کی عالمگیر تباہی اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو لیکن بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا تھا کہ لَا مَرَدَّ لَهٗ — (۳۰/۴۳) جہاں سے تباہی پلٹ کر واپس نہیں جایا کرتی۔ اس سیلاب کو روکنا کسی کے بس میں دکھائی نہیں دیتا۔

سوچنے والے سر پکڑ کر بیٹھے ہیں کہ ڈوبنے سے پہلے کم از کم اتنا تو معلوم ہو جائے کہ یہ سیلاب آیا کیسے؟ اس عالمگیر تباہی کا بنیادی سبب ہے کیا؟ اس کا سرچشمہ کونسا ہے؟ غنڈہ گردی یہاں پہلے بھی ہوتی تھی لیکن وہ افراد تک محدود تھی۔ اوباش نوجوان یہاں پہلے بھی پھرتے تھے لیکن — یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ۔ (۵۵/۴۱) وہ اپنی پیشانیوں سے پہچانے جاتے تھے۔ مجرم یہاں پہلے بھی ارتکاب جرم کرتے

سے تھے لیکن ان کا شمار معاشرہ کی مستثنیات (EXCEPTIONS) میں ہوتا تھا۔ لیکن اب تو یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ شریف انسان معاشرہ کے مستثنیات میں سے ہو گئے ہیں اور وہ بھی اس طرح ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ کوئی کسی کو بتا نہ دے کہ یہاں کوئی شریف آدمی یا باعزت گھرانا رہتا ہے۔ سوچنے والے سوچتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے معاشرہ کو یہ کیا ہو گیا کہ (غالب کے الفاظ میں)

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز ۔۔۔ گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتہ است

غمت بشہر شبیخوں زناں بہ ہنگۂ خلق ۔۔۔ عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتہ است

دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد

کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتہ است

سوچنے والے سوچتے ہیں اور اس کوشش ناکام سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ❋ تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں !

یہ اس لئے کہ یہ جن گوشوں میں ان اسباب و علل کی سراغ رسانی کے لئے اپنے راحلۂ فکر کو بھیجتے ہیں، وہاں یہ اسباب و علل ہوتے نہیں' اور جہاں سے ان کا سراغ مل سکتا ہے' ان گوشوں میں جانے کے یہ عادی نہیں۔ اس لئے ان کا پتہ نشان کیسے پا سکیں۔

بات یہ ہے کہ اس سے پہلے، خرابیاں افراد کی خرابیٔ سیرت و کردار کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں اس لئے ان کا دائرہ افراد تک محدود رہتا تھا۔ اب یہ خرابیاں ایک نظریہ کی پیدا کردہ ہیں۔ ایک فکر کی تخلیق ہیں۔ ایک خاص زاویۂ نگاہ کا فطری نتیجہ ہیں جسے اس طرح عام کیا گیا اور عام کیا جا رہا ہے کہ اس کے جراثیم ساری فضا میں پھیل گئے ہیں۔ اس لئے ان خرابیوں نے وبا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ نظریہ، یہ فکر، یہ زاویۂ نگاہ ہے سوشلزم کا جو عصرِ حاضر میں ابلیس کا مؤثر ترین حربہ ہے۔ سوشلزم (جیسا کہ فریب دہی کے لئے عام طور پر کہا جاتا ہے) ایک خاص معاشی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک فلسفۂ زندگی' ایک ضابطۂ حیات ہے جس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے جس کا اعلان لینن نے یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس (منعقدہ ۱۹۲۰ء) میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا تھا۔

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی ما فوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی "تصور" کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاق کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے، یہ تصور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق' محنت کشوں کی طبقاتی "جنگ" کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماوراء جو کچھ ہے' فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل

نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔

(MARX - ENGELS MARXISM - PP. 461 & 465)

جہاں تک اس انقلاب کو برپا کرنے کے طریق کار کا تعلق ہے، لینن اسی کتاب میں، اینگلز کا ایک اقتباس دیتا ہے جس میں کہتا ہے۔

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے پر اپنا اختیار و تسلط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھار اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی کراتا ہے۔

اس انقلاب کے بعد جس قسم کا اسٹیٹ قائم ہوگا، مارکس نے اس کے متعلق کہا تھا کہ وہ محنت کشوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام ہوگا۔ (لینن۔ ص ۲۲۲)۔ اس ڈکٹیٹرشپ کے متعلق، سٹالن اپنی کتاب (LENINISM) میں لکھتا ہے کہ۔

> ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود یکسر قوت پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور اچھی طرح سن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں قوت، غیر محدود قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کوئی سروکار نہ ہو۔

یہ ہے وہ ذہنیت جو سوشلزم کو عام کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اور یہی ہے وہ ذہنیت جس نے ملک میں اخلاق باختگی، لاقانونیت، فساد انگیزی، تشدد اور قتل و غارت گری کو عام کر دیا ہے۔ ہم اس لاقانونیت کا رونا بھی روتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ اس نظریہ سوشلزم کو بھی عام کرتے جاتے ہیں جو اس لاقانونیت کا سرچشمہ ہے۔ آپ ان نونہالانِ قوم سے ملئے۔ وہ نہ ان لاقانونیت سے شرمائیں گے اور نہ ہی اس تشدد سے کسی قسم کی ندامت محسوس کریں گے۔ وہ برملا کہیں گے کہ سوشلزم کا انقلاب آتا ہی اس طرح ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ یہاں تو کہا جاتا ہے کہ سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم لائی جائے گی تو وہ عجیب انداز کے خندہ استہزا سے اس کا استقبال کریں گے اور کہیں گے کہ مذہب سے ہمیشہ ایسا ہی (فریب دہی کا) کام لیا گیا ہے۔ پہلے بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ اب بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اسلامک سوشلزم، سوشلزم کی کوئی برانڈ نہیں۔ یہ محض دھوکا ہے کیونکہ اس ملک کے عوام مذہب پرست واقع ہوئے ہیں۔ ان کا خوش اور مطمئن رکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہنوز اقتدار جمہوری طریق سے حاصل کرنا مقصود ہے۔ ورنہ سوشلزم کے اتمام نتائج وہی ہیں جن کا ذکر مارکس، لینن اور سٹالن نے کیا ہے۔ یہ ہے وہ ذہنیت جو ہمارے بدنصیب ملک کی نئی نسل میں پیدا ہو چکی ہے اور جو دن بدن پختہ اور وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس کے بعد یہ معلوم کرنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے کہ ملک میں اخلاق شکنی، لاقانونیت اور تشدد کیوں بڑھتے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف جن لوگوں نے یہاں، اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر، مذہب کو ایک منظم شکل دے رکھی ہے ان کی حالت مدعیانِ سوشلزم سے کم خطرناک نہیں۔ انہوں نے، معلوم کس کس قسم کی ترغیبات و تحریصات سے نوجوانانِ ملت کے ایک خاص طبقہ (طلباء) کو اپنے گرد جمع کر لیا ہے، جنہیں دن رات (قولاً اور فعلاً) یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ:-

عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر شریعت کی رو سے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء)

ان نوجوانوں سے کہا جاتا ہے کہ سنتِ رسول اللہ کا اتباع اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ اور سنتِ رسول اللہ (معاذاللہ) یہ ہے کہ:-

جب حضورؐ نے کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر مجھے جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں (حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی۔ (ایضاً)

وہ تھی وہ ذہنیت جو نظریہ سوشلزم کی رُو سے، قوم کے مذہب گزیدہ نوجوانوں میں پیدا کی گئی ہے اور یہ ہے وہ ذہنیت جو شریعت کے نام سے مذہب پرست طبقہ میں پیدا کی جا رہی ہے۔ جہاں تک حصولِ اقتدار کے طریق کا تعلق ہے، سرِعام جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے لیکن درونِ خانہ انہیں اور قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بیرونِ خانہ اس کا علم ان الفاظ کی رو سے ہو جاتا ہے جو کبھی کبھی بے ساختہ ان کی زبان پر آ جاتے ہیں۔ (مثلاً) ابھی اگلے دنوں مودودی صاحب نے راولپنڈی میں کہا کہ:-

اگر پاکستان میں انتخابات کے ذریعے اسلامی نظامِ شریعت کا نفاذ نہ ہو سکے تو اسلامی انقلاب لانے کے لئے دوسرے طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔

(نوائے وقت۔ بابت ۲۷ اپریل ۱۹۷۵ء۔ صفحہ اول)

فرمایئے! اس قسم کی "شرعی تعلیم" کا نتیجہ، جھوٹ، فریب، قتل، غیر جمہوری طریقے اختیار کرنا نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا! یہ ہیں ملک میں لاقانونیت اور تشدد کے عام ہونے کے حقیقی اسباب۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

جب آپ قوم کے نوجوانوں کو اس قسم کے افکارِ تازہ دینگے تو ان سے اسی قسم کے جہانِ تازہ کی نمود ہوگی — طلوعِ اسلام مسلسل اٹھائیس برس سے چلا رہا ہے کہ قوم کی نئی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کرو تاکہ ان کے ذہن اس قسم کے زہرآلود افکار کی پرورش گاہ نہ بن سکیں۔ اربابِ نظم و نسق نے اس چیخ اور پکار کو کسی توجہ کا مستحق نہ سمجھا اور جماعتِ اسلامی نے، اپنی منظم مشینری کے ذریعے، طلوعِ اسلام کے خلاف ایسا پراپیگنڈہ کیا کہ اس کے قریب جانا تو ایک طرف، کوئی اس کی آواز تک نہ سننے پائے۔ اس کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لے۔ اس سے طلوعِ اسلام کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس کے پیشِ نظر اپنے ذاتی مفاد اور مصالح تھے ہی نہیں جو

اس مخالفت سے اس کا کوئی نقصان ہو جاتا۔ اس سے قوم تباہ ہو گئی۔ ملک برباد ہو گیا۔ اور کیا معلوم کہ اس تباہی اور بربادی کے اثرات کتنی نسلوں تک مسلسل آگے بڑھتے رہیں۔ تاریخ کے راستوں پر جن تباہ شدہ قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات عبرت نشاں نظر آتے ہیں، ان کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا۔ اور کیا خبر کہ ہمارے ساتھ (پناہ بخدا) وہی کچھ ہو جو اسپین میں ہوا تھا کہ نہ ہمارا کوئی نوحہ خواں باقی رہے نہ الواحِ مزار۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (۹۱/۱۴-۱۵) خدا کے قانونِ مکافات نے ان پر ایسا دندمہ (ROAD - ROLLER) چلایا کہ انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ ایسا کرتے وقت، کسی قسم کا احساسِ انجام خدا کا ہاتھ نہیں پکڑ لیتا کہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ "تقاضائے قانون" کے عین مطابق ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

(۲)

(۳)

سیاہ ترین جرم

حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انسانوں سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے حکومت کوئی بھی ہو، اس سے غلطیوں کا ارتکاب خارج از امکان نہیں ہو سکتا۔ قوم خوش بخت ہو تو اس کی حکومت لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ اسے اس کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے تاکہ وہ ان کی بروقت اصلاح کر سکے۔ قوم بدنصیب ہو تو وہ اسے برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اس کی غلطی کو غلطی کہے۔ اس سے اس کے مصاحبوں کی بن آتی ہے۔ وہ اس کے ہر عملِ سیاہ کو سفید بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں جس سے وہ حکومت سنگین ترین خود فریبی کا شکار، اور مرگ آفریں خوش فہمی کے مرض میں مبتلا رہتی ہے۔ ایسی حکومتوں کے سیاہ اعمال کی فہرست ان کے جانے کے بعد مرتب اور نشر ہوتی ہے۔

جب ہماری موجودہ حکومت کے بعد حسبِ دستور ان کا نامۂ اعمال مرتب ہو گا تو اس میں سرفہرست ایک ایسا کارنامہ نظر آئے گا جس کی سیاہی کبھی نہیں مٹ سکے گی۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے متجسس و مضطرب ہو گئے کہ وہ جرم کون سا ہو گا؟ آپ کا جذبۂ تجسس اور اضطراب بجا، لیکن جب ہم اس جرم کی نشاندہی کریں گے تو (ہمارا اندازہ یہ ہے کہ) آپ بیحد متحیر و متعجب ہوں گے کہ ہم نے اسے سیاہ ترین جرم کیسے قرار دے دیا؟ لیکن جب ہم اس کی وضاحت کریں گے تو (ہمیں امید ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے) کہ یہ جرم واقعی سرفہرست رکھے جانے کے قابل تھا۔

وہ جرم یہ ہے کہ حکومت نے امسال یومِ اقبال کی چھٹی کو پنجاب تک محدود کر دیا۔

کیوں؟ بات ہے ناں حیرت کی! اور (بظاہر) آپ کی حیرت بھی بالکل بجا اور درست ہے۔ کسی دن کی چھٹی کو بھی ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اسے ایسا سنگین جرم قرار دیا جائے۔ اس دن کو تو پھر بھی ایک

صوبے نے چھٹی قرار دے دیا۔ اگر اس دن ملک بھر میں کہیں تعطیل نہ ہوتی، تو بھی یہ کون سا ایسا جرم ہوتا؟

ہاں! ٹھیک ہے۔ اگر اس دن ملک میں کہیں چھٹی نہ ہوتی تو ہم اسے ایسا سنگین جرم قرار نہ دیتے۔ اس جرم کی سنگینی یہ ہے کہ اسے پنجاب تک محدود رکھا گیا۔ اب سنیئے اس کی وجہ۔

اقبالؒ نہ کسی شاعر کا نام ہے، نہ فلاسفر کا۔ اس سے مراد ایک ایسا صاحبِ بصیرت مردِ مسلمان ہے جس نے صدیوں کے بعد اسلام کی ان اساسات کو، جو دشمنوں کی سازش اور ہماری جہالت کے ملبے کے نیچے دب چکی تھیں، پھر سے اجاگر کیا۔ اس میں سب سے نمایاں حیثیت "اسلام کے نظریۂ قومیت" کو حاصل تھی۔ اس نے بتایا کہ مسلمانوں کا نسل یا وطن کے اختلاف یا نظریے کی بنا پر مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی اصل وحقیقت کو اس کی جڑ بنیاد سے کاٹ دیتا ہے۔ اسلام وحدتِ امت کا نام ہے جس کی تشکیل دین کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ اور یہ وحدتِ امت بھی درحقیقت وحدتِ انسانیہ کے عالمگیر پروگرام کے لئے قدمِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وحدتِ امت کے اس نظریہ کے سیاسی مضمرات بھی ہیں، لیکن اقبالؒ نے اسے اولاً و اساساً دین کے بنیادی تقاضا کی حیثیت ہی سے پیش کیا تھا۔ اسی لئے اس نے نظریۂ وطنیت کے متعلق برملا کہا تھا کہ ـــ جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے ـــ اور قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے ـــ وہ مختلف قومیتوں میں بٹے ہوئے ممالکِ اسلامیہ کو وحدتِ امت کی لڑی میں پرونا چاہتا تھا تو اس سے بنیادی مقصد یہ تھا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اور ظاہر ہے کہ "حرم کی پاسبانی" سے مقصد نفسِ اسلام کا تحفظ و استحکام ہی ہے۔ لیکن غیر مسلم ممالک و اقوام بالخصوص یورپ کو اس نظریہ میں جو سیاسی خطرات مضمر نظر آتے تھے ان کی وجہ سے ان کی طرف سے اس کی مخالفت، فطری اور لابدی تھی ـــ ایک نظریہ قومیت ہی نہیں۔ انہیں تو حقیقی اسلام کے ہر اساسی نظریہ کے احیاء میں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ اقبالؒ کے پیش کردہ اس نظریہ کی ہر محاذ سے مخالفت ہوئی۔ حتیٰ کہ انگلستان کا (بظاہر) اہلِ علم طبقہ بھی اس پر اعتراض کرنے سے باز نہ رہا۔ علامہ اقبالؒ نے پروفیسر نکلسن کے خط کے جواب میں جو مکتوب بھیجا اس سے واضح ہے کہ اس نظریہ کی کس کس انداز سے مخالفت ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ:-

> اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینانؔ کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس، اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ درحقیقت اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ نے پروفیسر نکلسن کو بتایا کہ وہ وحدتِ انسانیہ کے اس عظیم پروگرام کی ابتدا مسلمانوں سے کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مغرب کے سیاسی اغراض، اس بلند نصب العین کو پنپتا کب دیکھ سکتے تھے؟ انہوں نے مخالفت کی اور بہت سخت کی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران بھارت کی ہمنوائی میں مغرب کے نظریۂ قومیت کے مؤید نیشنلسٹ علماء کے نمائندہ مولانا حسین احمد مدنیؒ (مرحوم) کو سمجھاتے ہوئے کہ اس نظریہ سے اقوامِ مغرب کے پیشِ نظر کیا ہے' انہوں نے لکھا۔

> مجھے یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں افرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر (پہلی) جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔

نیشنلزم کے حامیوں کے علاوہ اقبالؒ کا پیش کردہ اسلامی نظریۂ وحدتِ امت' قادیانیوں پر بھی سخت گراں گزرتا تھا۔ وطن کو معیارِ قومیت قرار دینے سے تو ان میں اور مسلمانوں میں کوئی خطِ امتیاز نہیں کھنچتا تھا۔ یہ سب ایک ہی قوم کے افراد قرار پاتے تھے۔ لیکن ایمان کو معیارِ قومیت قرار دینے کا مطلب یہ تھا کہ یا تو وہ میرزا غلام احمد کی امامت کو چھوڑ کر امتِ محمدیہ میں شامل ہوں یا اپنی جداگانہ امامت کی بنا پر مسلمانوں سے الگ قوم قرار پائیں۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ (مرحوم) کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں واضح کیا تھا کہ:۔

> حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں، انکارِ خاتمیت کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے، بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھول دیتا ہے۔

یعنی (غیر منقسم) ہندوستان میں' انگریز اور ہندو کے علاوہ، نیشنلسٹ مسلمان اور قادیانی سب اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ کی مخالفت میں متحد تھے۔ ان کے علاوہ، کیمونسٹوں (یا سوشلزم کے حامیوں) کی طرف سے بھی اس نظریہ کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ ان کی مخالفت کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ کیمونزم (یا سوشلزم) ایک معاشی پروگرام ہی نہیں۔ وہ درحقیقت ایک فلسفۂ زندگی اور نظامِ حیات ہے جو اسلام

کے فلسفۂ زندگی اور نظامِ حیات کی ضد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مغرب کے بالغ نظر مفکرین کیمونزم کو ایک مذہب قرار دیتے ہیں۔ اسلام کی طرح، کیمونزم بھی اپنے نظریۂ زندگی کے اشتراک کی بنیادوں پر ایک جداگانہ قوم کی تشکیل چاہتا ہے جسے وہ سرِ دست (COMMUNITY) کہہ کر پکارتے ہیں۔ چونکہ اسلام اور سوشلزم کا معیارِ قومیت بھی ایک دوسرے کی ضد ہے، اور اس لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اس لئے سوشلسٹ بھی فکر و پیامِ اقبال کے سخت مخالف تھے (اور ہیں)

پاکستان وجود میں آگیا تو نظریۂ پاکستان (یا اقبال کے پیش کردہ فکرِ اسلامی) کے یہ سب مخالفین ہجرت کر کے ادھر آگئے۔ یہاں آنے کے بعد ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے یہ مہم شروع کر دی کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان میں اقبال کو ختم کر دیا جائے۔ جس طرح ہر باطل کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کے نام پر اپنے باطل نظریات کو عام کرتا ہے، اسی طرح فکرِ اقبال کے ان مخالفین نے حربہ یہ اختیار کیا کہ خود اقبالیین بن کر پہلے تو فکرِ اقبال کو مسخ کیا جائے اور پھر اسے ختم ہی کر دیا جائے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد بالعموم اور گزشتہ دس تین سالوں سے بالخصوص، جس تیزی کے ساتھ مزار، قبریں، خانقاہیں، بھنگ، چرس، چمٹے بجانے والے، عرسوں پہ ناچنے والے نمودار ہوئے ہیں، اسی سرعت کے ساتھ اقبال کے نام پر مجلسیں، محفلیں، انجمنیں، ادارے، وجود میں آرہے ہیں۔ اول الذکر سے مقصود اقبال کی اس تنذیر (WARNING) کو نگاہوں سے اوجھل کرنا ہے جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ یہ ابلیس کا خاص حربہ ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور ثانی الذکر سے مطلوب یہ ہے کہ فکرِ اقبال کی تصویر کے نیچے "عقیدتمندی" کے پردے میں ایسی شمعیں روشن کی جائیں جن کے دھوئیں سے اولاً وہ تصویر دھندلی ہوتی جائے اور بالآخر اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ امسال، بالواسطہ یا بلا واسطہ، حکومت کے زیرِ اہتمام یا زیرِ نگرانی جس قدر اقبال ڈے کی تقاریب منعقد ہوئی ہیں، ان میں فیض احمد فیض صاحب اور ان کے ہمنواؤں نے کس قدر مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ فیض صاحب اور ان کے ہمنوا سوشلزم کی فکر کے سب سے نمایاں مبلغ، 'لہٰذا' فکرِ اقبال کے سب سے زیادہ مخالفین میں سے ہیں۔ فکرِ اقبال اگر "نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر" تمام مسلمانوں کو "حرم کی پاسبانی" کے لئے امتِ واحدہ بنانے کا داعی تھا تو یہ حضرات اس بچے کھچے پاکستان میں، نسلوں اور صوبوں کی تفریق کی بنا پر چار قومیتوں کے پرچارک ہیں۔ وہ پمفلٹ کس کی نظروں سے اوجھل ہے جس کے دستخط کنندگان میں جناب فیض کا اسمِ گرامی سرِ فہرست تھا اور جس میں کہا یہ گیا تھا کہ:

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ

سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب وہ پمفلٹ نگاری اور تقریر بازی سے زیادہ کچھ کرنے کی استطاعت یا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ اب وہ (خدا کے فضل سے) مرکزی حکومتِ پاکستان سے وابستہ ہیں جہاں ان کی استطاعت و اختیار کی حدیں بہت وسیع ہیں۔ ان کے پل بوتے پر وہ فکرِ اقبال (یعنی اسلامی اساسات و مسلمات) کے مسخ اور تباہ کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور چونکہ ایک سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا ان کا "مقدس فریضہ" ہے، وہ اسے مشنری سپرٹ کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ "احمدیوں" کے خلاف ستمبر ۱۹۷۴ء کے فیصلہ کے ردِعمل کا بھی اس میں کس قدر ہاتھ ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اب فکرِ اقبال کے خلاف یہ محاذ آرائی زیادہ کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ اقبال کے پیش کردہ (اسلامی) نظریہ قومیت کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے خود اقبال کو اسلامی مفکر یا حکیم الامت کے مقام سے نیچے اتار کر، اسے وارث شاہ، بلھے شاہ یا شاہ حسین کی طرح، صوبائی سطح پر لے آیا جائے۔ اقبال ڈے کی چھٹی کو پنجاب کی حد تک محدود کر دینا اسی مہم کا پہلا عملی اقدام ہے۔ آپ ذرا سوچیے کہ اقبال کو پنجاب سے تعلق کیا ہے؟ انہوں نے ایک مصرعہ بھی پنجابی زبان میں نہیں کہا۔ پنجابیوں کو اقبال کے ننھیال سے جو سارٹیفکیٹ ملا وہ یہ تھا کہ

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد (ضربِ کلیم)

خطۂ پنجاب کے ساتھ اقبال کی نسبت اس سے زیادہ اور کیا بتائی جا سکتی ہے کہ وہ پنجاب (سیالکوٹ) میں پیدا ہوا۔ لاہور میں رہا اور وہیں بیوستِ خاک ہوا۔ وطن کی ان نسبتوں کو اقبال، "تمام بولہبی" کہہ کر پکارتا تھا اور اپنے متعلق کہتا تھا کہ:

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی — خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند (بالِ جبریل)

فکرِ اقبال کی مخالف قوتوں نے چونکہ ثابت یہ کرنا تھا کہ قومیت کا مدار "جوہرِ ملکوتی" (ایمان کا اشتراک) نہیں بلکہ وطن کی نسبت ہے، اس لئے انہوں نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اقبال کو ایک خاص خطۂ زمین سے پیوست شاعر کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ اب اگلے سال یہی حضرات، اقبال کی صد سالہ برسی منا رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس میں کیا کیا گل کھلائے جائیں گے۔ جہاں تک ہم اندازہ لگا سکتے ہیں اس میں ایسا لٹریچر مرتب کیا جائے گا جس سے فکرِ اقبال کی اسلامی (قرآنی) اساسات کو ختم کر کے رکھ دیا جائے۔ پھر اس لٹریچر کو تعلیم کے نصاب میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور آنیوالی نسلیں اسی پیکر کو حقیقی اقبال تصور کریں گی اور جب اس لٹریچر کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی کیا جائے گا تو ساری دنیا میں اقبال کی وہی تصویر سامنے آئے گی جسے اس لٹریچر میں پیش کیا گیا ہو گا۔ یعنی ایک خاص خطۂ زمین کا شاعر۔

ہمارا خیال ہے کہ اب آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ ہم نے یہ کیوں کہا ہے کہ جب موجودہ حکومت کا نامۂ اعمال

مرتب ہوگا تو اس کے جرائم میں سرِفہرست ان کا یہ فیصلہ درج ہوگا کہ یوم اقبالؒ کی چھٹی صوبہ پنجاب تک محدود ہے۔ اگر اس دن کی کہیں بھی تعطیل نہ ہوتی، تو یہ جرم اتنا گھناؤنا نہ ہوتا کہ اس سے اقبالؒ کے مقام اور اس کی فکر پر کوئی زد نہ پڑتی۔ لیکن اسے پنجاب تک محدود کر دینا تو اتنی بڑی سازش ہے جس کے نتائج و عواقب بڑے دوررس ہو سکتے ہیں۔ اور یہ حقیقت اور بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے جب دوسری طرف یہ دیکھا جائے کہ یوم اقبالؒ (۲۱ اپریل) کے قریب ایک ہفتہ بعد یومِ یکم مئی کی پورے پاکستان میں چھٹی کی گئی کہ اس کے محرکات شکاگو کے تھے۔

پھر ہمارے ارباب اقتدار بھی بڑے دلچسپ بزرگ واقع ہوتے ہیں۔ یوم اقبالؒ پر ملک گیر تعطیل کا فیصلہ مرکزی حکومت کی ذمہ داری تھی۔ اس نے یہ چھٹی نہیں کی مگر محترم صدر مملکت پاکستان نے یوم اقبالؒ کی تقریب پر اپنے پیغام میں فرمایا کہ:۔

> اگر ملک کے نوجوانوں تک اقبالؒ کا پیغام پہنچایا جاتا رہتا تو ان میں صوبائی اور علاقائی تعصب پیدا نہ ہوتا۔ (پاکستان ٹائمز یکم مئی ۱۹۷۵ء)

جس اقبالؒ کو خود مرکزی حکومت نے ایک صوبہ کا شاعر قرار دے دیا، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی فکر سے صوبائی تعصب کس طرح ختم ہو جاتا۔ مرکزی حکومت کے ایک وزیر، محترم ملک معراج خالد صاحب نے یوم اقبالؒ ہی کی تقریب پر اپنی ایک تقریر میں فرمایا:۔

> علامہ اقبالؒ کو پنجاب کا شاعر قرار دینا قطعی طور پر غلط ہے۔ یوم اقبالؒ پر صرف پنجاب میں چھٹی ہوگی یہ ہمیں ہرگز قبول نہیں۔ (نوائے وقت ۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۵ء)

یکم مئی کے نوائے وقت میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق "انہوں نے دیگر صوبوں میں یوم اقبالؒ کے موقع پر چھٹی نہ ہونے کے واقعہ کو "انتہائی شرمناک قرار دیا"۔ یعنی انہوں نے اس "انتہائی شرمناک واقعہ" کا ذمہ دار صوبوں کو قرار دیا اور اس طرح مرکزی حکومت کو اس سے بری الذمہ قرار دینے کی سعی نامشکور فرمائی اور یہ بھول گئے کہ ملک گیر چھٹیوں کا فیصلہ مرکزی حکومت کیا کرتی ہے نہ کہ صوبے الگ الگ۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اس کی تازہ ترین مثال "یکم مئی" کی تعطیل عام تھی۔ اس کا فیصلہ مرکزی حکومت نے کیا تھا اور چھ مہینے پہلے کیا تھا۔

بہرحال، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلام دشمن متحدہ سازشوں کے اس قدم اول کا نتیجہ یہ ہے کہ اقبالؒ، نہ مفکر اسلام رہا نہ حکیم الامت، نہ شاعر مشرق رہا نہ معبود پاکستان۔ وہ پنجابی شاعر بن کر رہ گیا۔ اس سے تو بھارت ہی اچھا رہا کہ اس نے اقبالؒ کو کم از کم سارے ہندوستان کا شاعر تو تسلیم کر لیا ہے۔ بہرکیف، ہمارے ہاں کا قدم اول ہے۔ دوسرے قدم کے لئے ۱۹۷۷ء کا انتظار فرمایئے جب اقبالؒ کا جشن صد سالہ منایا جائے گا۔ ابلیس نے اپنے سیاسی فرزندوں سے یہی کہا تھا ناں کہ:۔

اقبالؒ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

سو اس کے اہتمامات ہو رہے ہیں۔

بابُ المراسلات

یہ ایک نفسیاتی مرض ہے

یوں تو وہ کون سا دن ہے جب ہمیں ایسے مکتوب موصول نہ ہوتے ہوں جن میں ملاّ ذہنیت کے کسی نہ کسی گوشے کو سامنے لایا گیا ہو، لیکن حال ہی ہمارے علم میں ایک ایسا واقعہ لایا گیا ہے جو اپنی شقاوت و قساوت کے لحاظ سے ایسا بھیانک اور گھناؤنا ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حادثے میں حادثہ سے ایک ایسے نوجوان کی اچانک موت واقع ہو گئی جو دور و نزدیک اپنی شرافت اور نیکی میں اپنی مثال آپ تھا۔ ماں باپ کے بڑھاپے کا واحد سہارا۔ بہن بھائیوں کا غمخوار، بچوں کا مشفق باپ۔ بیوی کے خوابوں کی حسین تعبیر۔ اس کی اس طرح اچانک موت سے نہ صرف اس کا گھر ماتم کدہ بن گیا بلکہ گرد و پیش دور دور تک کہرام مچ گیا۔ جنازہ کے لئے اپنے پرائے ہجوم کر کے آ گئے۔ آنسوؤں کے سیلاب اور آہ و فغاں کے کہرام میں جنازہ اٹھایا گیا تو قریب کی مسجد سے مولوی صاحب نے پورے دبدبہ اور طنطنہ سے اعلان فرما دیا کہ اس شخص کا جنازہ پڑھنا حرام ہے۔ اس اعلان سے فضا پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ وجہ پوچھنے پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ یہ شخص طلوعِ اسلام پڑھا کرتا تھا۔

مکتوب نگار نے جس درد و الم اور آہ و فغاں کے ساتھ اپنے خط کا باقیماندہ حصہ لکھا ہے، اس سے تو آسمان پر فرشتوں کے دل بھی دہل گئے ہوں گے۔ لیکن ہم سے پوچھا یہ گیا ہے کہ مولوی صاحبان کی مختلف حرکات کے متعلق بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس سے ان کا کون سا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن اس طرح ان کی نمک پاشی کے متعلق بات قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے انہیں بالآخر حاصل کیا ہوتا ہے! ایک ایسے گھرانے کو جس کا سینہ زخموں سے چھلنی ہو رہا ہو، اس طرح اذیت پہنچا کر ان حضرات کو کیا لذت ملتی ہے؟

ہم بھی باقی واقعہ کو چھوڑ کر یہیں سے بات آگے چلاتے ہیں کہ انہیں اس سے کیا لذت ملتی ہے۔ یہ حقیقت سائیکالوجی (علم النفس) کا مسئلہ ہے اور اسی کی رُو سے اس جگر پاش لیکن فکر انگیز سوال کا جواب مل سکتا ہے ملاّ یا مولوی کسی شخصیت کا نام نہیں۔ یہ ایک ذہنیت ہے جسے ماہرینِ علم النفس نفسیاتی مرض سے تعبیر کرتے ہیں اور جس میں یہ حضرات بالعموم مبتلا ہوتے ہیں۔ اس مرض کے وجوہ و اسباب اور نتائج و اثرات کو سمجھنے کے لئے ان لوگوں کی عمومی زندگی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

آپ کسی مذہبی مکتب میں چلے جائیے۔ آپ وہاں ایسے طالب علموں کو دیکھیں گے جن کے بھنچے ہوئے چہرے

نہ ہو، اللہ کو دھنسی ہوئی آنکھیں بے نور اور عام جسمانی حالت نہایت سقیم ہوگی۔ پہلی نگاہ میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ افلاس زدہ ماحول کے پروردہ" اور ایسے گھرانوں سے برآوردہ ہیں جن میں بڑی عسرت اور گھٹن تھی۔ ذہنی طور پر دیکھئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ انہیں اس لئے یہاں بھیجدیا گیا ہے کہ یہ کسی اور کام کے قابل ہی نہ تھے۔ ان مکاتب کا کاروبار بالعموم خیرات پر چلتا ہے۔ اسی سے ان بچوں اور نوجوانوں کی کفالت کی جاتی ہے۔ جتنے کہ لوگوں کی نذر نیاز کی دیگیں بھی اکثر مدارس میں آتی ہیں۔ محلے میں کہیں مرگ ہو جائے، اس کے "قل" جمعرات یا چالیسویں کے ختم پر، ان بچوں کو بلا لیا جاتا ہے اور وہاں سامنے رکھے ہوئے کھانوں اور پھل مٹھائی کو یہ جن للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، اس سے ان کی نفسیاتی کیفیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ ماہرینِ علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ اس قسم کے انداز و اسلوب اور ایسے ماحول میں پرورش اور تربیت یافتہ بچے اور نوجوان جذبات کمتری (INFERIORITY COMPLEXES) کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کی ساری شخصیت کو متاثر کر دیتے ہیں۔

یہاں سے نکلنے کے بعد، یہ نوجوان بالعموم مساجد کے امام یا خطیب بن جاتے ہیں اور وہاں بھی ان کی معاش کا دارومدار، بالواسطہ یا بلاواسطہ، خیرات ہی پر ہوتا ہے۔ جتنے کہ جسے اب محکمۂ اوقاف کہا جاتا ہے، وہ بھی خیرات کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ "وقف" کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے کچھ جائیداد خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لئے وقف کر دی ہو۔ جس شخص کا ذریعہ معاش تخلیقی (CREATIVE) ہو۔ خواہ وہ جوتے گانٹھنے والا موچی ہو اور خواہ ذہنوں کو جلا دینے والا معلم و مفکر۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، لیکن غیر تخلیقی کاموں (جیسے امامت وغیرہ) کے معاوضہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ خیرات ہی ہوتا ہے۔ اس لئے، ایسا انسانی شخصیت (PERSONALITY) کے جوہر شرف و اعتماد مرجاتے ہیں اور اس میں گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے کی وہی للچائی ہوئی نظریں" جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان میں اب مستقل محرومی کا احساس بیدار کر دیتی ہیں جس سے ان کے سینے میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لئے ان میں ایک ذہنیت ابھرتی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں (SADISM) کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے لئے ابھی ہماری زبان میں کوئی موزوں لفظ وضع نہیں ہو سکا، مطلب اس سے ہوتا ہے دوسروں کو اذیت پہنچا کر لذت حاصل کرنا۔ اس کی بہت سی اقسام ہیں۔ لیکن سب سے گھناؤنی شکل وہ ہے جو مذہب کے مقدس نقاب میں نمودار ہوتی ہے۔ آپ ان حضرات کے وعظوں کو سنئے۔ ان کا نوے فیصد سے زیادہ حصہ، دوسروں پر طعن و تشنیع کے کچوکوں، طنز و تنقید کے تیروں اور تحقیر و تضحیک کے نشتروں اور توہین و تذلیل کے سوفاروں پر مشتمل ہوگا۔ وہ جس طرح اچھل اچھل کر دوسروں کو "مقدس گالیاں"

---

[1] ایک مولوی صاحب سے ہماری اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ان کے سینے میں جذبات نفرت کے سوا کچھ نہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے بھائی ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ اس سے ان (مولوی صاحب) کا احساسِ محرومی سارے معاشرہ کے خلاف نفرت و انتقام کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

رہے ہوں گے۔ اس سے صاف نظر آجائے گا کہ وہ انہیں ذلیل کر کے کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔ وہ اس اذیت رسانی سے کس درجہ لذت حاصل کر رہے ہیں۔ اس کو (SADISM) کہا جاتا ہے جو احساسِ کمتری و محرومی کا پیدا کردہ مرض ہوتا ہے۔

علم النفس کی تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ اس ذہنیت کا مریض، بنیادی طور پر بزدل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی تیر اندازی کے لئے ایسی کمین گاہوں کو منتخب کرتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے مسجد بہترین حفاظت گاہ ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مسجد ضرار کو جو ارصادًا لمن حارب اللہ ورسولہ (دیکھئے ۹/۱۰۷) یعنی کمین گاہ سے تعبیر کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ پھر وہ اپنے حملوں کے لئے بھی ایسے ہدف تلاش کرتا ہے جہاں سے اسے مقابلہ کا خطرہ نہ ہو۔ آپ سوچئے کہ جہاں میت والا گھر (ماتم کدہ) ان کا ہدف ہو اور یہ حضرت خود کھڑے ہوں محراب مسجد میں، تو اس سے بڑھ کر ان کی لذتِ اذیت رسانی کا موزوں مقام اور موقعہ اور کون سا ہوگا؟

طلوع اسلام کے خلاف ان کی محاذ آرائی کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ ان کے خلاف کبھی ان کی پست سطح پر نہیں اترے گا۔ اس لئے یہ اس کے خلاف جو کچھ جی میں آئے کہتے رہتے ہیں۔ یہ حضرات ہمارے خلاف جو کچھ براہ راست کہتے ہیں اسے ہم درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ (اور ہماری یہ روش ان کی آتشِ انتقام کو اور بھڑکاتی ہے۔ یہ بھی نفسیات کا ایک مسلمہ ہے)۔ لیکن جب یہ لوگ اس قسم کی حرکتوں پر اتر آتے ہیں جس کی ایک مثال زیر نظر المیہ ہے تو اس سے ہمیں بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ہمارے علم میں اس قسم کے واقعات بھی آئے ہیں کہ ایک شخص کی بیٹی کا نہایت موزوں مقام پر رشتہ طے پا رہا ہے۔ تمام شرائط کے فیصلے ہو چکے ہیں اور اب صرف اس کے لئے رسمی تقریب کا انتظار ہے کہ یہ "مجاہدین" لڑکے والوں کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتے ہیں کہ لڑکی کے والد "پرویزی" ہیں اس لئے یہاں یہ رشتہ نہ کرنا۔ اور اس سے وہ مظلوم بچی ساری عمر ان کی جان کو روتی رہتی ہے۔ (ایسا بھی ہوا ہے کہ شادی ہونے کے بعد انہوں نے مہم شروع کر دی کہ یہ نکاح ہی ناجائز ہے کیونکہ یہ ایسے شخص کا پڑھایا ہوا ہے جو "پرویزی" ہے۔ آپ سوچئے کہ جس (سادہ دل) میاں بیوی سے یہ کہہ دیا جائے کہ "از روئے شریعتِ حقہ" تمہارا نکاح ہی ناجائز ہے، ان کی زندگی کس جہنم سے گزرے گی؟) اس قسم کی مہمات ان "صالحین" کی طرف سے بھی ہوتی ہیں جو طلوع اسلام کی مخالفت خاص مقاصد کے تحت کرتے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر ان کا جذبۂ محرکہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "امامانِ مسجد" کے جذبۂ اذیت رسانی کی تسکین ہوتا ہے۔

یہ مرض لاعلاج ہوتا ہے اس لئے ہم ان لوگوں سے تو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ لیکن ہم ان کے مقتدیوں سے یہ ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب یہ لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں (جنہیں آپ بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ آپ باہر آکر ان کے خلاف بہت کچھ کہتے رہتے ہیں) تو آپ انہیں وہیں ٹوک کیوں نہیں دیتے۔ آپ ان سے کیوں نہیں کہتے کہ حضرت! آپ ہمیں خدا و رسول کی باتیں سنائیے اور اس قسم کے طعن و تشنیع یا کفر سازی سے مجتنب رہیے کہ اس سے قوم میں انتشار بڑھتا اور نفرت پھیلتی ہے۔ اگر آپ نے دو چار دفعہ بھی ان سے

ایسا کہہ دیا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد انہیں ایسا کہنے کی جرأت نہیں ہو گی، کیونکہ (جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے) اس قسم کی ذہنیت کے حامل بنیادی طور پر بزدل ہوتے ہیں۔ انہیں اس طرح روک دینے سے آپ ان ظلموں کی داد رسی کر سکیں گے، جو ان کی تیر اندازی کا نشانہ بنتے ہیں اور جس سے ان بیماروں کے بہت سے بنتے ہوئے کام بگڑ جاتے ہیں، یا جن کے رستے ہوئے زخموں پر یہ نمک چھڑکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم اس غمزدہ گھرانے سے کہیں گے کہ جس طرح آپ نے اس جواں مرگ کے صدمۂ جانکاہ کو صبر و تحمل سے برداشت کر لیا ہے۔ اسی طرح اس کرب و اذیت کو بھی بھلا دیجئے۔ جو ان "مقدسین" کی طرف سے آپ کو پہنچائی گئی ہے۔ باقی رہا مرنے والا (خدا اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے) تو نہ اس کی نماز جنازہ میں ان لوگوں کی شرکت اسے بخشوا سکتی تھی، اور نہ ہی ان کی عدم شرکت اس کے حسن عمل کو ضائع کر سکتی ہے۔ اس قسم کے فتووں سے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ ان کی مریض ذہنیت کی نمود ہو جائے۔

ادارۂ طلوع اسلام اور اس کے ہزاروں ہمنوا مرحوم کے اعزہ کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔

(۰)

۲۔ مُلّا کی ایک اور قبیح حرکت

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ حکومت کی طرف سے شائع شدہ نکاح نامہ کے فارم میں ایک کالم (نمبر ۱۸) ہوتا ہے جس میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا گیا ہے؟ نکاح خواں (یعنی مولوی صاحب) بغیر کسی سے پوچھے اس کالم کے سامنے (×) کا نشان لگا دیتے ہیں جس سے بیوی اپنے اس جائز حق سے محروم رہ جاتی ہے جس کی ضمانت اس کالم میں (فریقین کی رضامندی سے) ہاں لکھنے سے حاصل ہو جاتی تھی۔ البتہ مُلّا اس سے اپنے جذبۂ اذیت رسانی کی تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے لڑکی کے والدین یا سرپرستوں سے کہا تھا کہ وہ نکاح نامہ کے فارم کو بڑی احتیاط سے خود پُر کیا کریں۔ نکاح خواں کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔

اس پر قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے ایک ایسی بات بتائی ہے جو مُلّا کی مذکورہ بالا حرکت سے کہیں زیادہ قبیح اور مکروہ اور انتہائی اذیت رساں ہے اور جس کا ہمیں بھی اس سے پہلے علم نہیں تھا۔ نکاح نامہ کے فارم میں ایک کالم یہ بھی ہوتا ہے کہ آیا دلہن کنواری ہے یا بیوہ ہے یا مطلقہ۔ ظاہر ہے کہ اس میں کنواری سے مطلب غیر شادی شدہ ہے۔ ہمارے اس دوست نے بتایا کہ بالعموم دیہات میں ہوتا یہ ہے کہ نکاح کے وقت مولوی صاحب اس کالم تک پہنچنے پر لڑکی کے والد یا سرپرست سے کہتے ہیں کہ کنواری سے مطلب یہ ہے کہ لڑکی کی عصمت (VIRGINITY) محفوظ ہے اور جب وہ کہتے ہیں کہ اس میں شک کی کون سی بات ہے، تو مولوی صاحب نہایت معصوم بن کر کہتے ہیں کہ بھائی صاحب، اس کے لئے تو ثبوت بہم پہنچانا ہوگا۔ یہ شریعت کا معاملہ ہے۔ بلا ثبوت میں اسے کس طرح یاد کر لوں۔ اس کے بغیر تو نکاح ہی نہیں ہو سکتا۔

اس سے آپ سوچئے کہ لڑکی کے والدین یا سرپرستوں پر اُس وقت کیا بیتتی ہے، مولوی صاحب یہ باتیں چپکے چپکے انہیں علیحدہ لے جا کر کرتے ہیں اور ہزار منت سماجت کے بعد نقدی پر معاملہ طے پا جاتا ہے اور مولوی صاحب نکاح پڑھانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔

جب ہم نے یہ سنا تو یقین مانیئے کہ ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور ماننا پڑا کہ ابلیس کے حربے واقعی بڑے گہرے اور بعید از قیاس ہوتے ہیں۔

ہم قوم کے لکھے پڑھے طبقہ سے انسانیت کے نام پر درخواست کریں گے کہ وہ بھولے سادہ لوح، ناواقف لوگوں کو نکاح نامہ کے مندرجات کے صحیح مفہوم سے آگاہ کریں اور اس طرح انہیں مثلاً کے اس قسم کے حربوں سے بچانے کی کوشش کریں۔ دوسری طرف ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ نکاح نامہ کے نام میں "کنواری" کی جگہ "غیر شادی شدہ" کے الفاظ چھپوائیں تاکہ ملاّ کے لئے اس قسم کی حرکت کرنے کی گنجائش نہ رہے۔

(۰)

۳۔ کشف والہام

پرویز صاحب کے نام ایک علم دوست قاری طلوع اسلام کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

"کشف والہام کے متعلق صحیح پوزیشن واضح کرنے سے آپ نے مجھ پر اور میرے جیسے نہ معلوم کتنے اور سینکڑوں ہزاروں لوگوں پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جس کا بدلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے میری ایسی الجھنیں دور ہو گئی ہیں جن میں میں عمر بھر گرفتار رہا اور ان سے رہائی پانے کی مجھے کوئی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ میں ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جس میں کشف والہام کے عقیدے کو ایمان کی بنیاد مانا جاتا تھا۔ چنانچہ میں بھی کشف والہام کے مدعی بزرگوں کو اسی عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ لیکن جب میں بعض باتوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا تو میں عجیب الجھن میں پھنس جاتا۔ کشف والہام کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ بعض بزرگوں کو بلند حقائق کے متعلق، جو عام ذرائع علم کی رَو سے سمجھ میں نہیں آتے، اپنی طرف سے علم عطا کر کے ان پر حقیقت منکشف کر دیتا ہے۔ ان بزرگوں میں شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی سب سے بلند مقام پر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے کشف نے ان پر وحدت وجود کا انکشاف کیا اور اس سے خدا تعالےٰ کے متعلق ایک عجیب و غریب عقیدہ ظہور میں آیا۔ یہ عقیدہ (یا پھیلا کہ) عین اسلام بن گیا۔ لیکن ان کے بعد مجدد الف ثانی حضرت امام سرہندی رح کو خدا نے کشف کے ذریعے بتایا کہ وحدت الوجود کا عقیدہ باطل ہے اور اسلام کے خلاف۔ اس کے برعکس وحدت شہود کا عقیدہ حقیقت ہے۔ اب بات یوں سامنے آئی کہ ایک بزرگ کو اللہ تعالےٰ نے بذریعہ کشف یہ بتایا کہ حقیقت وحدت الوجود ہے اور دوسرے بزرگ کو اسی خدا نے بذریعہ کشف یہ بتایا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت وحدت شہود ہے۔ ان کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تشریف لائے تو انہیں اللہ تعالےٰ نے بذریعہ کشف بتایا کہ وحدت وجود اور وحدت شہود کے

دونوں عقیدے صحیح ہیں۔ تم ان میں مطابقت کی شکل لوگوں کو بتاؤ۔ میں اس انجمن میں کہا کہ جب ان سب بزرگوں کو ہستی باری تعالیٰ کا تصور نحوہ خدا کی طرف سے منکشف کیا گیا ہے تو اس تصور کو ایک جیسا ہونا چاہیئے یہ کیا کہ کسی کو کشف کے ذریعے ایک قسم کا تصور ملا اور کسی کو اس کے بالکل متضاد متصور۔ یہی صورت میرے ساتھ میرزا غلام احمد صاحب کے کشف والہام کے سلسلہ میں پیش آئی۔ ان سے پہلے ہزار سال میں صوفیاء کرام اور اولیاء حضرات کو (جنہیں خود میرزا صاحب کشف والہام مانتے تھے) کشف کے ذریعے خدا نے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں اور آخری زمانے میں آسمان سے نازل ہوں گے۔ لیکن مرزا صاحب کو خدا نے کشف کے ذریعے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں اور کشمیر میں دفن ہیں۔ سمجھ میں نہ آیا کہ میرزا صاحب کے کشف کو صحیح مانا جائے یا ان سینکڑوں ہزاروں اولیائے کرامؒ کے کشف کو جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ "ان سے پہلے" ہی نہیں بلکہ خود ان کی زندگی میں بھی ایسے صاحب کشف والہام موجود تھے جو مرزا صاحب کے عقاید کے مخالف تھے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ اور پیر جماعت علی شاہ اور ان کے علاوہ متعدد اولیاء حضرات میرزا صاحب کی زندگی میں موجود تھے اور ان کا کشف انہیں حضرت عیسیٰؑ کو چوتھے آسمان پر زندہ دکھاتا تھا اور میرزا صاحب کا کشف کشمیر کے ایک مزار میں۔ پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے ساتھ تو میرزا صاحب کے مناظرے بھی ہوتے تھے جن کا ذکر ان کی کتابوں میں ملتا ہے۔

لاہوری "احمدی" حضرات، کشف والہام کے امکان کے سلسلہ میں امام سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا نام بطور سند پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم ملنے لیتے ہیں کہ ان کے دعاوی کی رو سے کشف کا وجود و امکان ثابت ہو گیا۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ ان کے کشف نے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر موجود ہیں اور میرزا صاحب کے کشف نے انہیں وفات یافتہ بتایا؟

پھر میرزا صاحب کے متعلق ایک اور بات بھی میرے لئے الجھن کا موجب تھی۔ وہ اپنے کشف والہام کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بن باپ کے قائل تھے لیکن ان کے سب سے بڑے معتقد مولانا محمد علی مرحوم اپنی علمی تحقیق کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش عام انسانوں کی طرح مانتے تھے۔ گویا میرزا صاحب کی معلومات بذریعہ کشف اور ان کے ایک بہت بڑے معتقد کی معلومات بذریعہ انسانی علم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر تضادات کی وجہ سے میں بڑی سخت الجھن کا شکار چلا آ رہا تھا اور ان سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آپ نے قرآن شریف کی روشنی میں کشف والہام کی صحیح پوزیشن واضح کر کے میرے دل سے یہ کھٹک دور کر دی۔ کشف والہام ان بزرگوں کے اپنے ہی عقاید اور تصورات کا عکس ہوتے ہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ علم نہیں ہوتا۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ علم، وحی ہی تھا جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا ہوتا تھا اور جس کی رو سے حضرت نوحؑ سے لے کر رسول اللہؐ تک کے انبیاءؑ کی وحی میں حقیقت ایک ہی نظر آتی تھی۔ متضاد حقیقتیں نہیں۔ جو علم متضاد حقیقتیں دکھائے وہ منجانب اللہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کا بہت بہت احسان مند اور شکر گذار ہوں۔ والسلام"

۴۔ حجِ بدل

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ حجِ بدل کی حیثیت کیا ہے اور اگر اسے کسی فوت شدہ کی طرف سے ادا کیا جائے، تو کیا اسے اس سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟

طلوعِ اسلام:۔ حجِ بدل کا قرآن کریم سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔ باقی رہا مردہ کو اس سے کچھ فائدہ، تو حجِ بدل ہی نہیں جو کچھ بھی مرنے کے لئے ہمارے ہاں کیا جاتا ہے اس سے اسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اُسے فائدہ اپنی اعمال سے ہوتا ہے جو اس نے خود کئے ہوں۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، خدا کے قانونِ مکافات کا واضح اور اٹل فیصلہ ہے۔ اس سے صرف پسماندگان کو سکون حاصل ہوتا اور ان کا غم غلط ہو جاتا ہے اور جہاں خود یہ رسوم ہی باعثِ پریشانی ہو جائیں، وہاں الٹا غم بڑھ جاتا ہے۔

(○)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار ۔ صبح ۸½ بجے
بمقام ۲۵-بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور
ٹیلیفون (۸۰۸۰۰)

لائلپور میں
بروز جمعہ ۔ (بذریعہ ٹیپ) ۵½ بجے سہ پہر
بمقام ۔ دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۔ ۴۵ کوتوالی روڈ
متصل حیات سرجری کلینک ۔
رابطہ کے لئے ۔ فون (۲۴۹۴)

ملتان میں
بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
۴ بجے بعد نماز جمعہ ۔ بمقام دفتر شاہ سنز
بیرون پاک گیٹ ۔ ملتان
(فون ۲۰۰۱)

سیالکوٹ میں
ہر اتوار ۔ صبح ۸½ بجے
(بذریعہ ٹیپ) ۔ چوہدری محمد دین ولد کالو دین
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام ۔
محمد دین ٹی سٹال ۔ کرسچین ٹاؤن ۔ بارہ پتھر ۔ سیالکوٹ

کراچی میں
ہر اتوار ۔ صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)
بمقام ۔ دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۔ دارالقائد
۳۰-۱/بی یسین سٹاپ ۔ ناظم آباد ۔ کراچی ۱۸
فون (۶۱۰۴۸)

راولپنڈی میں (بذریعہ ٹیپ)
ہر جمعہ ۵ بجے سہ پہر
بمقام جے - ۱۹۶
لیاقت روڈ ۔ راولپنڈی

کوئٹہ
ہر اتوار ۳½ بجے بعد دوپہر
(بذریعہ ٹیپ) ۔ بمقام ۲۰ گوردت سنگھ روڈ
فون (۷۰۰۰) کوئٹہ

واہ
(بذریعہ ٹیپ)
بعد نماز جمعہ ۔ بمقام
۱۵ ۔ جہلم روڈ ۔ واہ WAH

حقائق و عبر

۱۔ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

(۱) ایک صاحب لکھتے ہیں کہ روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۷ / فروری ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

> لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے خانیوال میں ایک شخص آصف کی رٹ درخواست کا فیصلہ سناتے ہوئے رولنگ دی ہے کہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد لڑکی اپنی مرضی سے اپنی شادی کرنے کی شرعاً مجاز ہے اور اگر اس عمر کے بعد لڑکی اپنی شادی خود کر لے تو اس پر بالغ ہونے سے شادی کی ممانعت کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اس رولنگ کی رو سے لڑکی کی شادی کے لئے بلوغت کی عمر پندرہ سال بتائی گئی ہے لیکن مسلم فیملی لاز آرڈیننس (۱۹۶۱ء) اور (CHILD MARRIAGE RESTRAINT ACT, 1929) اور DISSOLUTION (OF MUSLIM MARRIAGE ACT, 1939) میں لڑکی کے لئے سنِ بلوغت سولہ سال مقرر ہے۔ اس سے یہ اہم معاملہ مشتبہ سا ہو گیا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ صحیح پوزیشن کیا ہے۔ تاکہ لوگ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں!

صحیح پوزیشن یہ ہے کہ ہائی کورٹ کی یہ رولنگ بھی صحیح ہے اور جن قوانین کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ بھی درست ہیں۔ اس پر آپ پوچھیں گے کہ اس تضاد کی وجہ کیا ہے۔ اور ان میں مفاہمت کی شکل کیا؟ سو تضاد کی وجہ تو وہ "دوگونہ عذاب" ہے جس میں اس ہماری مملکت کی "جانِ مجنوں" بری طرح مبتلا ہے۔ اس نے اپنا (نام تو) اسلامی رکھ لیا لیکن اسلامی بننے کی جرأت ہنوز نصیب نہیں ہوئی۔ لہٰذا یہ ثنویت کی فطری کشمکش میں ماخوذ ہے۔ مسئلہ مستفسرہ میں صورت یہ ہے کہ "قانونِ شریعت" کی رو سے لڑکی کی بلوغت کی عمر پندرہ سال ہے اور ملکی قوانین کی رو سے سولہ سال۔ ان میں مفاہمت کی شکل یوں پیدا کی گئی ہے کہ پندرہ سال کی لڑکی اپنی مرضی سے اپنی شادی تو جس سے چاہے کر سکتی ہے لیکن شادی کرنے والے کے خلاف اگر کوئی استغاثہ دائر کر دے تو وہ مجرم قرار پاتا اور سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نکاح پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ بحال رہتا ہے۔

دیکھا آپ نے کہ ہمارے واضعینِ قوانین نے مفاہمت کی کیسی عمدہ صورت پیدا کر دی ہے؟ اب اگر دنیا

اس پر ہنسے تو اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور ہے۔

مجھے زمانہ جو دیوانہ کوئی بات نہیں
اٹھاؤ ہاتھ میں پیمانہ کوئی بات نہیں

(۲) روزنامہ پاکستان ٹائمز (لاہور) بابت ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء میں یہی خبر اس تصریح کے ساتھ شائع ہوئی ہے کہ اس رولنگ میں کہا گیا ہے کہ

A HUSBAND HAS THE PREFERENTIAL RIGHT OVER OTHERS IN CASE A QUESTION ABOUT THE CUSTODY OF HIS WIFE ARISES.

محترم مستفسر کہتے ہیں کہ قانون کے لفظ RIGHT اور CUSTODY کا مفہوم کیا ہے، اس کا تو مجھے علم نہیں، لیکن جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے، یہ نظریہ احترامِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنی CUSTODY میں رکھنے کا مطالبہ بطور استحقاق AS OF RIGHT کرے۔ کسی "چیز" کو اپنے قبضے میں رکھنے کا حق تو جائز قرار پا سکتا ہے لیکن کسی انسان کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا حق، ناقابلِ فہم ہے۔ اس قسم کا حق، غلاموں SLAVES کی صورت میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ جسے قرآن کریم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ قرآن کریم کی رو سے عورت اور مرد دونوں آزاد انسان ہیں، اور یکساں واجب التکریم۔ عورت، بیوی بن کر اپنی آزادی اور تکریم انسانیت کو کھو نہیں دیتی۔ شادی ایک معاہدہ ہے جو فریقین کی رضامندی سے طے پاتا اور فریقین کی رضامندی ہی سے قائم رہتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی ایک کا دوسرے کو بطور حق اپنے قبضہ یا تحویل میں رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ہم اس سے بالکلیہ متفق ہیں کہ بیوی تو ایک طرف، بچے کی حضانت (کفالت) تک کے سلسلہ میں باپ یا ماں (یا دیگر رشتہ داروں) کا حق نہیں تسلیم کیا جاتا۔ مدارِ فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کی حفاظت، پرورش اور تربیت کہاں بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔

باقی رہا تکریم انسانیت کا سوال، سو اگر پاکستان کو یہ سعادت نصیب ہو گئی کہ وہ اپنے قوانین قرآنی اصولوں کے مطابق مدون کرے، تو ان قوانین کی بنیادی اینٹ شرف و تکریم انسانیت کا تحفظ ہو گا۔

(۰)

۲۔ سودِ حرام اور سودِ حلال

ہفت روزہ ایشیا کی ۱۶ فروری ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں، مودودی صاحب کی مجلس کی روئداد کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

چرچا سے آتے ہوئے ایک صاحب نے پوچھا کہ کیا رہن زمین کی پیداوار لینا سود میں شامل ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر اسلام کی شرائط کے مطابق مالک زمین کو اس کا حصہ

ملتا ہے تو سود کا اشتباہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی آدمی رقم لے کر زمین رہن پر لیتا ہے اور پھر ساری آمدنی خود استعمال کرتا رہتا ہے تو ایسا فعل بالکل سود خواری ہے اس سے بچنا چاہیئے۔

بات یوں ہوئی کہ

(۱) اگر ایک شخص کسی زمیندار کو ایک ہزار روپیہ قرض دے کر اس سے پچاس روپے سالانہ بھڑوتی (اضافہ) لیتا ہے تو وہ سود ہے اور حرام۔

(۲) وہی شخص اس زمیندار کو ایک ہزار روپیہ قرض دے کر اس کی زمین رہن رکھ لیتا ہے اور وہ زمین کسی کاشتکار کو دو سو روپے سالانہ ٹھیکہ پر دے دیتا ہے تو

ا۔ اگر وہ دو سو کا دو سو خود رکھ لیتا ہے تو یہ سود ہے اور حرام۔ لیکن

ب۔ اگر وہ اس میں سے چھپن روپے زمین کے مالک کو دے دیتا ہے اور بقایا پونے دو سو روپے خود رکھ لیتا ہے تو یہ شیرِ مادر کی طرح حلال ہے۔ (مودودی صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کے فتوے میں "اسلامی شرائط" سے کیا مراد ہے؟)

اس قسم کے ہیں وہ خود ساختہ فقیہہ جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ قیامت کے دن یہ لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۱۶/۲۵) اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی جنہیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کرتے رہتے تھے۔

پھر ان صاحب سے یہ بھی کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کو یہ اختیار کس نے دے رکھا ہے کہ آپ حرام اور حلال کے فیصلے کرنے بیٹھ جائیں۔

۳۔ ایک اور فیصلہ

انہی کی ایک اور مجلس کی روئیداد کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔

ایک سوال بنک کی ملازمت کے بارے میں تھا۔ مولانا محترم نے فرمایا۔ بنک کی ملازمت ناجائز ہے۔ اگر آدمی کو کوئی دوسری ملازمت میسر نہ آئے اور اس پر فاقوں کی نوبت آرہی ہو تو وہ بکراہت عارضی طور پر بنک میں کام کر سکتا ہے۔ جب جائز ذرائع سے روزی کمانے کا انتظام ہو جائے تو اسے فوراً بینک کی ملازمت چھوڑ دینی چاہیئے۔

(ایشیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء)

مودودی صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ خود اس حکومت کی ملازمت کے بارے میں ان کی "شریعت" کا کیا فیصلہ ہے۔ جس کا سارا کاروبار بالواسطہ یا بلاواسطہ بنکنگ سے ملوث ہے؟ کیا ان کے نزدیک صورت یہ ہے کہ بنکوں کی ملازمت تو ناجائز ہے لیکن مرکزی حکومت کی وزارتِ مالیات (جس کی تحویل میں تمام بنک ہیں) کی ملازمت جائز!

۴۔ یہ بھی اسلام، وہ بھی اسلام

ایشیا کی ۹ فروری کی اشاعت میں، مودودی صاحب کی ایک اور مجلس کی روئیداد کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

> مولانا نے فرمایا۔ انتخاب کا طریق کار حالات کے مطابق ہے۔ اسلام نے کسی خاص طریقے کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا۔ البتہ اسلام نے اس بات کی سختی سے تردید کی ہے کہ کوئی آدمی اقلیت کے بل بوتے پر حکمران ہے۔ اسلام صرف اس آدمی کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے جسے مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ ان حضرات کا طریق یہ ہے کہ یہ پہلے اس قسم کے دو چار الفاظ بول دیتے ہیں کہ "اسلام یہ کہتا ہے" یا "اسلام کا یہ فیصلہ ہے" اور اس کے بعد جو اپنے جی میں آئے کہہ دیتے ہیں۔ نہ یہ خود اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کے حلقۂ مریدین میں سے کوئی اتنا پوچھتا ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کی سند کیا ہے۔
اب آگے چلئے۔ مودودی صاحب کا اس سے پہلے فیصلہ یہ تھا کہ:-

> جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں۔۔۔ اقلیت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

خود حکمران پارٹی کے اندر کثرت و قلت کے متعلق آپ کا فیصلہ یہ تھا کہ:-

> امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ لیکن اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی صفحہ ۴۱)

ضمناً۔ مودودی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ "اسلام صرف اس آدمی کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے جسے مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو"۔ واضح رہے کہ اسلام (قرآن کریم) کسی انسان کی حکمرانی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ خدا کے سوا کسی کو حق حکومت نہیں دیتا۔ اس کی حکومت کے بروئے کار آنے کا ذریعہ اس کی کتاب کی فرماں روائی ہے اسلامی حکومت کی ذمہ داری اس کتاب کے احکام کی عملی تنفیذ ہے۔ اور بس۔

پھر مودودی صاحب نے اسی مجلس میں کہا۔

> اسلام نے اس طریقۂ انتخاب کو غلط قرار دیا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں مسلمان نمائندوں کے انتخاب کے لئے غیر مسلم بھی اپنی رائے دیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر آپ (اور آپ کی جماعت) موجودہ خلاف اسلام طریق انتخاب میں حصہ کیوں لیتے ہیں؟ مانا کہ آپ کو اس طریق انتخاب کے بدل دینے کا اختیار حاصل نہیں لیکن اس کا اختیار تو آپ کو ہے کہ آپ اس خلاف اسلام فعل میں شریک نہ ہوں اور اس سے تعاون نہ کریں۔

پھر فرمایا:-

اسلام کے طریقِ انتخاب میں ایک بات یہ بھی دیکھی جاتی ہے کہ جس آدمی کو منتخب کرنا مقصود ہو وہ اسلامی تعلیمات پر کس حد تک عمل پیرا ہے ؟

یہ کہتے وقت مودودی صاحب بھول گئے کہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں یہ فرمایا تھا کہ

> اگر ایک منفرد جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (امروز - ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

—————(۰)—————

۵۔ انانیت کے کرشمے

مودودی صاحب کے برادرِ بزرگ (مولانا) ابوالخیر صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "ابوالاعلیٰ تو ــ بعد از خدا بزرگ توئی ــ ہو چکے ہیں۔ ان کی یہی انانیت ہے جس نے انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور اسلام کو ٹھوکہ بنا دیا ہے۔ وہ جو جی میں آئے کہہ دیتے ہیں۔ اور اتنا بھی سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ ان کے اپنے سابقہ بیانات یا تحریروں کے خلاف ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء کے ایشیا میں ان کی شام کی ایک مجلس کی روداد شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک صاحب نے کہا کہ۔

"بعض ممالک میں لوگ بس فرض ہی پڑھتے ہیں اور سنتیں چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ فعل درست ہے؟" اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

> قطعی غلط ہے۔ ایسے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سنتیں بعد کے لوگوں نے خود گھڑی ہیں۔ اور شروع شروع میں صرف فرض ہی پڑھے جاتے تھے۔ یہ لوگ جو دلائل دیتے ہیں وہ سرے سے بے بنیاد ہیں۔ جن لوگوں کے ذریعے سے ہم تک قرآن پہنچا ہے، انہی کے ذریعے سے سنت اور احادیث بھی ملی ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ان لوگوں نے قرآن تو ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا اور سنت اور احادیث غلط پہنچائیں۔ عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن اور سنت پہنچانے والے یا سچے ہیں یا جھوٹے۔ اگر وہ قرآن کے بارے میں سچے ہیں تو لامحالہ سنت کے بارے میں بھی انہوں نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ درست ہے اور اگر انہوں نے سنت کے بارے میں خیانت کی ہے اور اسے ہم تک غلط پہنچایا ہے تو ان کا پہنچایا ہوا قرآن کیسے درست ہو سکتا ہے ؟ جب ہم قرآن کو درست مانتے ہیں تو منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی پہنچائی ہوئی سنت اور احادیث کو درست تسلیم کریں۔

اس جواب میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ نہ سائل نے اس کی تصریح کی کہ کون سے ملک میں ایسا ہوتا ہے، نہ مودودی صاحب نے اس کی وضاحت کی ضرورت سمجھی۔ بات مبہم چھوڑ دی تاکہ ان کی روایتی وسوسہ انگیزی

کار فرما ہے۔ جواب کے اگلے حصہ میں مودودی صاحب تاثر یہ دینا چاہتے ہیں کہ "منکرین سنت" (جن کے متعلق انہوں نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کون لوگ ہیں) صرف فرض پڑھتے ہیں، سنتیں نہیں (کیونکہ وہ سنت کے منکر ہیں)۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو کیا وہ یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائینگے کہ جو لوگ صرف فرض پڑھتے ہیں، تو کیا یہ "انکار سنت" ہے؟ کیا فرض پڑھنا "اتباع سنت" نہیں؟ فرض کون سے قرآن کریم میں لکھے ہیں؟ جس طرح سنتوں کا پڑھنا رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہے اسی طرح فرض پڑھنا بھی حضورؐ ہی کی طرف منسوب ہے۔ آپ ایسے لوگوں کے متعلق اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس سنتِ رسولؐ اللہ کا اتباع کرتے ہیں جسے وہ سنت سمجھتے ہیں۔ اور یہی مسلک خود مودودی صاحب کا بھی ہے۔ وہ جسے خود سنتِ رسولؐ اللہ قرار دیں اسی کو سنت سمجھتے ہیں۔ دوسری سنتوں کو بدعت اور دین میں تحریف قرار دیتے ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص۳۰۵)

باقی رہی مودودی صاحب کی یہ دلیل کہ "جن لوگوں کے ذریعے سے ہم تک قرآن پہنچا ہے انہی کے ذریعے سے سنت اور احادیث بھی ملی ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ان لوگوں نے قرآن تو ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا اور سنت اور احادیث غلط پہنچائیں۔" اس باب میں دیکھئے کہ مودودی صاحب اس سے پہلے کیا فرما چکے ہیں۔

> نبیؐ کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپ نے ارشاد فرمایا ہو وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو۔ لیکن قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبیؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ص۲۷۰)

غور کیجئے کہ یہاں قرآن کو ہم تک پہنچانے اور حدیثوں کو پہنچانے میں فرق کر دیا گیا ہے یا نہیں؟ دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں:-

---

لہ ہماری معلومات کے مطابق، شیعہ حضرات صرف فرض پڑھتے ہیں، سنتیں وغیرہ نہیں پڑھتے۔ کیا مودودی صاحب انہیں "منکرین سنت" قرار دینگے؟

فرقہ اہل قرآن البتہ منکرِ سنت ہے لیکن وہ لوگ نہ فرض پڑھتے ہیں نہ سنتیں۔ ان کی نماز سب سے الگ ہے۔

طلوعِ اسلام نماز میں فرض، سنتیں وغیرہ اسی طرح پڑھنے کی تاکید کرتا ہے جس طرح امت کے مختلف فرقے پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ کسی فرد یا فرقہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ ان ارکان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔

احادیث کی تنقید و تحقیق و ترتیب کا کام جو کچھ ابتدائی تین یا چار صدیوں میں ہوا ہے وہ اگرچہ نہایت قابلِ قدر ہے مگر کافی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلہ میں کرنا باقی ہے

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۷۳)

کیا قرآنی آیات کی بھی یہی صورت ہے؟

متعین طور پر آپ نے لکھا:۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۵۲ء)

مودودی صاحب سے تو کچھ کہنا بے کار ہے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں سے ہم اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب کی ان تحریروں کی روشنی میں، ان کے اس جواب کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے ہم نے پہلے درج کیا ہے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ ایسے اہم معاملات میں بھی ان کے ہاں کس قدر تضادات پائے جاتے ہیں۔!

۴۔ تھیاکریسی میں کیا ہوگا؟

طلوعِ اسلام میں اس حقیقت کو متعدد بار نمایاں کیا گیا ہے کہ نوعِ انسان کی تاریخ کے تاریک ترین ادوار وہ ہیں جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آیا۔ (اسے تھیاکریسی کہتے ہیں)۔ پاکستان میں جب یہ پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اس لئے اس میں زمامِ اقتدار علماء کے ہاتھوں میں دی جانی چاہیئے" تو اس سے مراد تھیاکریسی کا قیام ہوتا ہے۔ اگر (پناہ بخدا) کہیں ایسا ہو گیا تو اس میں انسانیت پر کیا بیتے گی، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ لاہور سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ محدث۔ اس کے شمارہ (بابت محرم۔ صفر ۱۳۸۵ھ) میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ علماءِ حق کے لئے لمحۂ فکریہ۔ اس کی ابتداء ان سطور سے ہوتی ہے۔

علمائے کرام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث، دینِ نبی کے ترجمان، صداقتِ اسلام کے شاہد، طائفۂ منصورہ کی جان، اور ملتِ اسلامیہ کے اصلی نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو بیک وقت کسی ایک طبقہ کو ایک سالہا سال کے شغل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے انہیں ناقابلِ تسخیر محاذ اور قابلِ صد رشک اعزاز تصور کیا جاتا رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ سعید اس احترام، اکرام، اعتماد اور عزت کا اہل بھی ہے۔ کثرھم اللہ سوادھم۔

اس زورِ مدح خودی گوئیم کے بعد علمائے کرام سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور اس کی بازیابی کے لئے متحد ہو جائیں۔ اگر انہوں نے اس مقام کو حاصل کر لیا تو مملکت میں ان کے اقتدار کا کیا عالم ہوگا۔ اس کی وضاحت کے لئے انہوں نے ایک واقعہ درج فرمایا ہے اسے غور سے سنیئے۔ لکھتے ہیں:۔

مصری حکومت کا ایک نائب السلطنت اصل میں غلام تھا جو کسی طرح برسرِ اقتدار آگیا تھا۔ غلام اصل میں، اسلامی بیت المال کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے حضرت امام عزالدین بن عبدالسلام نے اعلان کیا کہ یہ شخص بیت المال کی جائیداد ہے اور شرعی طریقے پہ آزاد نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس فتوے سے بڑی کھلبلی مچ گئی۔ حکام نے بلا کر پوچھا کہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ فرمایا:-

ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کو نیلام کریں گے اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا۔ انہوں نے جا کر بادشاہ سے کہا کہ یہ شیخ ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے بڑی کوشش کی مگر شیخ نے اپنے الفاظ واپس لینے سے انکار کر دیا جس سے برہم ہو کر شاہ سے شیخ کی شان کے خلاف کوئی غیر محتاط جملہ نکل گیا۔ آپ نے سن کر وہاں سے کوچ کر دیا۔ پھر کیا تھا، سارے شہر میں کہرام مچ گیا اور بادشاہ کو خود جا کر منتوں سے واپس لانا پڑا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ:-

وہ امراء سلطنت کو خود نیلام کریں۔

نائب السلطنت غصے حلال میں آکر کہا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ تلوار لیکر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، دستک دی۔ شیخ کا بیٹا آیا۔ دیکھا کہ نائب السلطنت تلوار سونتے کھڑا ہے۔ جاکر بتایا تو شیخ نے کہا کہ

بیٹا! آپ کا باپ اس قدر خوش نصیب کہاں کہ اس کو شہادت ملے۔ پھر باہر نکلے تو دیکھتے ہی نائب السلطنت کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اور پاؤں میں گر گیا اور کہا آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا آپ کا نیلام۔ پھر فرمایا رقم کس مد میں ڈالیں گے؟ فرمایا، مسلمانوں کے کاموں میں۔ پوچھا، قیمت کون وصول کرے گا؟ فرمایا، میں خود۔ اس نے کہا، بہت اچھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک ایک امیر کو نیلام کیا گیا اور ہر ایک کی بولی بولی گئی اور قیمت وصول کر کے وہ خیر کے کاموں میں صرف کی گئی۔

(طبقات الشافعیہ۔ ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت)

اس واقعہ کے متعلق تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ یہ حقیقت ہے یا محض افسانہ، لیکن اسے فخر کے ساتھ پیش کرنے والوں سے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سے آپ نے علماء کے دبدبہ کی دھاک بٹھا کر اپنے جی کو تو خوش کر لیا لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے اسلام کی کیا صورت دنیا کے سامنے آتی ہے؟ کیا وہ مذہب جس میں انسانوں کو سربازار نیلام کیا جائے اور ان کی بولیاں دی جائیں، اس قابل قرار پا سکتا ہے کہ اسے دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے اور دنیا اسے خندہ پیشانی سے قبول کرے؟ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا واسطہ کہ ان کے اقوال و افعال سے اسلام پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان حضرات کی اسی قسم کی حرکات ہیں جن سے ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل دین سے برگشتہ ہی نہیں متنفر ہوتی اور دنیا میں سیکولرازم پھیلتی جا رہی ہے۔

(بقیہ)

نقد و نظر

طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۷۵ء میں مولانا عنایت اللہ اثری وزیر آبادی (ثم گجراتی) کی چند ایک تصانیف پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اس میں ہم نے لکھا تھا کہ مولانا صاحب مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہونے کے باوجود، بڑی جرأت کے مالک ہیں کہ بعض ایسے نظریات و عقاید جو اہل حدیث کے ہاں مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ ان کی نہایت واضح الفاظ میں تردید کرتے ہیں۔ حدیث پر ان کی نگاہ بڑی وسیع ہے، اور آیات قرآنی پر بھی انہیں بڑا عبور حاصل ہے۔

اس کے بعد ہمیں، ڈاکٹر سید سجاد حسین مجیدی اے۔ ایف۔ ایم مکتب، جہلم، ہی کی طرف سے مولانا صاحب کی مزید تصانیف اور رسائل موصول ہوئے ہیں جن کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ مولانا محترم کا انداز یہ ہے کہ ایسے مروجہ عقاید و نظریات کے سلسلہ میں، جو قرآن مجید کے خلاف ہیں لیکن ان کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ وہ احادیث کی ایسی تاویل کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کا مفہوم قرآن کے خلاف نہ جائے۔ اس قسم کی کوشش تو مستحسن ہے لیکن یہ ہر جگہ کامیاب نہیں ہو سکتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض مقامات پر مولانا صاحب کی تاویل اور دلیل بڑی کمزور ہو جاتی ہے۔ ان کی اصل دشواری ان کی ایک مسلک (مسلک اہل حدیث) کے ساتھ وابستگی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی خاص مسلک (فرقہ) کی پابندی اور قرآن کریم پر غور و فکر، ساتھ ساتھ چل نہیں سکتے۔ اس راہ میں ایسے مقامات آجاتے ہیں جہاں ان دونوں میں تصادم ہوتا ہے۔ جو شخص کسی خاص فرقہ سے وابستہ نہیں ہوتا اس کے لئے ایسے مقامات سے بحفاظت آگے بڑھ جانا آسان ہوتا ہے۔ کہ اس کے نزدیک حق و صداقت کا معیار اور سند قرآن کریم ہوتا ہے۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے وہ اسے بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ جو اس کے خلاف جاتی ہے، اسے مسترد کر دیتا ہے۔ لیکن کسی خاص فرقہ سے وابستہ شخص نہ اپنے فرقہ کے عقاید کو چھوڑ سکتا ہے نہ قرآن مجید کو۔ اس لئے وہ تاویلات کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔ جن مقامات میں مولانا اثری کو اس قسم کی الجھن لاحق نہیں ہوتی وہاں ان کی تحقیق پر دل سے بے ساختہ جذبات تحسین و آفرین ابھرتے ہیں، لیکن جہاں وہ کمزور تاویلات میں الجھ جاتے ہیں وہاں افسوس ہوتا ہے کہ ایسے متبحر عالم کی کاوشیں بھی کس طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ مولانا صاحب سے ان کی عمر کے اس آخری حصہ میں یہ امید کرنا تو خوش فہمی ہوگا کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی کر لیں گے۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے قرآن کریم کی تعلیم کی تائید میں لکھ دیا ہے، مغفرت میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

ہمارے لئے ان کی موصولہ تصانیف و رسائل پر تبصرہ مشکل ہے اس لئے ہم ان کے مختصر تعارف پہ اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) البیان المختار فی ما ورد من انباء الرسل الاخیار۔ ہماری کتب روایات و تفسیر میں حضرات انبیاء کرام کی طرف جو بعض نہایت قابلِ اعتراض قصے منسوب کئے گئے ہیں، اس کتاب میں ان کی تردید کی گئی ہے یہ مصنف کی بڑی قابلِ قدر کوشش ہے۔

(۲) بہتان عظیم علی الخلیل الصدیق ابراہیم۔ یہ مذکورہ سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور مخصوص ہے حضرت ابراہیمؑ کی طرف وضعی روایات کی تردید کے لئے۔

(۳) تصفیۃ العبس عن تفسیر سورۃ عبس۔ سورۃ عبس کی تفسیر میں جو کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کی مجلس مبارک میں ایک دو غریب) نابینا صحابیؓ آئے تو آپ نے (معاذ اللہ) کبیدہ خاطر ہو کر منہ پھیر لیا۔ اس میں اس کی تردید کی گئی ہے۔

(۴) برہان حق علی الوحی الخفی۔ فرقہ اہل حدیث کا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم وحی جلی اور حدیث وحی خفی ہے اس کتاب میں اصولی طور پر تو اس عقیدہ کی تائید ہے لیکن زیادہ تفصیل اہلِ قرآن کے اس عقیدہ سے متعلق ہے کہ نمازوں کی تعداد تین ہے۔ ہوا یوں کہ فرقہ اہل قرآن کے بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) نے لکھا کہ قرآن کریم کی رو سے پانچ وقت کی نمازیں ثابت ہیں۔ مولانا آتری صاحب نے اس کی تردید کی اور کہا کہ قرآن مجید سے صرف تین وقتوں کی نماز ثابت ہے۔ مولانا چکڑالوی کی وفات کے بعد ان کے متبعین (بلاغ القرآن سے متعلق اہل قرآن) نے مولانا آتری کی اس تحقیق کے نتیجہ کو اختیار کر لیا۔ مولانا صاحب نے اس بحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جہاں تک وحی خفی کے اثبات کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک مولانا صاحب کی کاوشوں میں یہ کمزور ترین ہے جسے دیکھ کر ہمیں صدمہ ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی انسان کو کہاں پہنچا دیتی ہے۔

(۵) ترجمۃ القضاء فی نکاح مریم الحصان البتول العذراء۔

(۶) نظر حذیمف میلاد المسیح عیسیٰ ابن مریم۔

(۷) عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ ابن مریم۔ مولانا صاحب کی تحقیق کا مخصوص موضوع یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کی تین کتابوں پر تبصرہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت فروری ۶۴ء میں آچکا ہے۔ زیرِ نظر تین کتابیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ مولانا صاحب کے متبعین میں سے کوئی اہلِ قلم ان تمام کتابوں کا ملخص حسین اور مربوط انداز سے ایک کتاب میں مرتب کر دے۔ ایسی کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی۔

(۸) تہذیب القرآن اور آمد مرزا۔ (۹) قطع الوتین من بشیر الدین (پانچ نمبر)۔ (۱۰) خلیفۃ المتنبی۔ (۱۱) گوسالہ سامری۔ یہ تمام رسائل ردِ مرزائیت سے متعلق ہیں۔ نیز (۱۲) انفعاق البصر فی انشقاق القمر بھی بہ حیثیت مجموعی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ ان سب کا ملخص بھی ایک مجلد میں آجاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ (۱۳) متعدد رسائل میں مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اور (۱۴) حیاۃ التبلیغ کے ۹ حصوں میں اپنی تبلیغی

سرگرمیوں کی سرگزشت پیش کی گئی ہے جو زیادہ تر ذاتی کوائف پر مبنی ہے اور انداز مناظرانہ۔

مولانا صاحب کے رسائل سے نظر آتا ہے کہ ان کا کس قدر قیمتی وقت اور توانائی فرقہ وارانہ نزاعی مسائل کی نذر ہوگیا۔ مدت ہوئی انہوں نے آیات فلما تبین کے نام سے سورۃ القصار تک کی تفسیر قرآن مجید عربی زبان میں شائع کی تھی۔ اگر وہ اسی انداز سے پورے قرآن کریم کی تفسیر اردو زبان میں [illegible] تو وہ ان کے تمام دیگر تصنیفی کارناموں پر بھاری ہوتی اور دین کی بہت بڑی خدمت۔ اب بھی اگر وہ اس کی اصلاح کر سکیں تو وہ ان کے لئے بہترین توشۂ آخرت ہوگا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

(۷)

۱۵۔ علامہ اقبالؒ اور ہم ۔ (ڈاکٹر اسرار احمد)

(۱۶)۔ قرآن مجید کے حقوق اور علامہ اقبالؒ ۔ (سید نذیر نیازی)

یہ دو پمفلٹ ہیں جو ہمیں انجمن خدام القرآن لاہور کی جانب سے موصول ہوئے ہیں۔ بڑے خوبصورت انداز میں چھپے ہوئے۔ اول الذکر کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہے اور ثانی الذکر پر قیمت درج نہیں۔

پہلا پمفلٹ مشتمل ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر پر جو انہوں نے ۳۰ مئی [illegible] کو [illegible] کالج لاہور کے ایک اجتماع میں فرمائی تھی۔ اس تقریر میں پہلے ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے متعلق کہا ہے کہ:-

> ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی ہے کہ احیاء اسلام کی شرط لازم تجدید ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور تشکیل جدید کی کوشش ہو یا احیاء اسلام اور غلبۂ دین حق کی سعی و جہد۔ دونوں کا اصل منبع و مدار اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے۔

اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ:-

> میں دیکھتا ہوں کہ ملت اسلامی اور دین حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے اس طرح قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اس قدر بلکہ اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ مرحوم کو تھا۔

اور اس کے بعد ساری تقریر اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ بنا بریں اس کی اہمیت اور افادیت میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس وادی میں نیا نیا قدم رکھا ہے لیکن ان کے ارادے [illegible] اور ان کی آرزوئیں بڑی مبارک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

کلام و پیام اقبالؒ کے سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلہ میں بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم متعین اور واضح کیا جائے جنہیں حضرت علامہؒ نے اس کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان کے پیام کے سمجھنے میں اصل دقت یہیں سے لاحق ہوتی ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم واضح نہیں کیا گیا اور ابھی

سے وہ بے شمار غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کی بنا پر فکرِ اقبالؒ کو قسم قسم کے اعتراضات کا (دانستہ یا نادانستہ) ہدف بنایا جا رہا ہے۔ (مثلاً) حضرت علامہؒ کے کلام میں سب سے زیادہ وارد ہونے والی اصطلاح "عشق" ہے جسے وہ "عقل" کے بالمقابل استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ~~~ عشق بمقام مصطفیٰؐ، عقل بمقام بولہب ~~~ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ عشق سے ان کی کیا مراد ہے اور وہ عقل کا کس طرح حریف ہے، حالانکہ علامہؒ خود عقل کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں، اور قرآن کریم کی بھی یہی تعلیم ہے۔ اس قسم کی الجھنیں، علامہؒ کی اصطلاحات کا صحیح مفہوم متعین کرنے ہی سے دور ہو سکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مشکل ترین فریضہ کو محترم سید نذیر نیازی نہایت عمدگی سے سرانجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے جس فرصت اور سکون کی ضرورت ہے، قوم کی بدقسمتی کہ وہ انہیں عمر بھر نصیب نہیں ہو سکا۔ مردہ پرست اقوام کی کیفیت بڑی تعجب انگیز اور عبرت آموز ہوتی ہے۔ وہ اپنے ابنائے گراں قدر کو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ کر مار دیتی ہیں اور اس کے بعد ان کی قبروں پر شاندار قبے تعمیر کرتی اور چڑھاوے چڑھاتی ہیں۔ ہماری قوم، ایک سال یوم اقبالؒ منانے پر جس قدر صرف کرتی ہے، اگر اسی کو ان مقاصد کے لئے وقف کر دے تو اقبالؒ پھر سے زندہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا پمفلٹ انہی سید نذیر نیازی صاحب کی ایک تقریر پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۵ اردسمبر ۱۹۷۳ء کو پہلی سالانہ قرآن کانفرنس کی تقریب پر کی تھی (اور جس کا موضوع تھا "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کیا ہیں؟" نیازی صاحب نے یہ بتایا ہے کہ ان حقوق کو علامہ اقبالؒ نے کس طرح اور کہاں تک ادا کیا۔ اقبالؒ اور نیازی صاحب کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

لیکن یہاں پھر تکمیلِ شوق کے راستے میں "تنگیٔ داماں" کا گلہ حائل ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اتنے قلیل سے وقت میں اشارات ہی سے بات کر سکتے تھے۔ بایں ہمہ، انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے خوب کہا ہے۔

لاہور میں قیام کیلئے

صاف ستھرے ہوادار کمرے، مناسب شرح پر

عمدہ، لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے

معیاری طعامگاہ

فون ۵۲۷۵۹

پارک وے ہوٹل

PARK-WAY

آپ کی تشریف آوری کا مشکریہ

مینجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

نوٹ

(۱) خط وکتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے ورنہ تعمیل میں دشواری ہو گی۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ بھیجئے۔

کلیج انڈسٹریز

حکومت پاکستان کے منظور شدہ
برآمد کنندگان

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳ - راولپنڈی

کروشیا وغیرہ کا کام کرنیوالی خواتین کے لئے بہترین موقع

مندرجہ ذیل مراکز سے رجوع فرمائیے

۱- مزمل انڈسٹریل ہوم - گلی [illegible] - محلہ فیروز پورہ راولپنڈی

۲- منور دیبلا - لیہ (ضلع مظفر گڑھ) ضلع مظفر گڑھ میں برآمد EXPORT کا واحد قانونی ادارہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

شہرہ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

۱۔ من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن دیگر اہلِ مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن، خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔

قیمت مجلد ۔ پچیس روپے

۲۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصہ آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کشمکش، شیطان، ملائکہ، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور، علومِ حاضرہ کی روشنی میں۔

قیمت مجلد ۔ بیس روپے

۳۔ جوئے نور

حضرات انبیاء کرام اور اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں۔ آسمانی انقلاب کے خلاف، مفاد پرست گروہوں کا محاذ؛ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔ حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک۔

قیمت مجلد ۔ بیس روپے

۴۔ برقِ طور

صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل، قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول، شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم رہ سکتی؟ ارضِ مقدس کی داستان۔ قیمت مجلد ۔ بیس روپے

۵۔ شعلۂ مستور

حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات۔ کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں؟ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ واقعہ تصلیب کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم اور عصرِ حاضر کے محققین کے نزدیک۔ بصیرت افروز حقائق، حقیقت کشا معلومات۔ قیمت مجلد پچیس روپے۔

۶۔ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت

مقامِ نبوت کیا ہے؟ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالتِ محمدیہ کس طرح ابدیت در کنار ہے۔ آنے والے کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا۔ تحریکِ احمدیت کی اصل حقیقت اور غرض و غایت۔ "احمدی" لٹریچر کا بے لاگ تجزیہ اور نتیجہ۔ بڑی اہم کتاب ہے۔ قیمت مجلد [illegible] روپے

نوٹ ۔ قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں!

ملنے کا پتہ (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی گلبرگ لاہور ۔ (۲) مکتبہ دین و دانش ۔ چوک اردو بازار لاہور

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ

فرقہ اہل قرآن

کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا تجزیہ

(پرویز)

فرقہ اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں

قرآن کے نام پر ——— قرآن سے دشمنی

پروفیسر

میں شروع ہی میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ (۱) نہ میرا تعلق کسی فرقہ سے ہے، نہ ہی میں نے کوئی اپنا فرقہ کھڑا کیا ہے۔ میں قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی کو شرک سمجھتا ہوں۔ (۲) نماز، روزہ وغیرہ جملہ ارکان اسلام کی ادائیگی عام مسلمانوں کی طرح کرتا ہوں۔ کسی فرد یا فرقہ کو ان میں تغیر و تبدل کا مجاز نہیں سمجھتا۔ نہ ہی کسی نئے طریق کے وضع کرنے کا مختار۔ (۳) تحفظِ ناموسِ رسالت و عظمتِ قرآن کریم میرا جزوِ ایمان اور زندگی کا مشن ہے۔ جہاں ان پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے، اس کی مدافعت میرا تقاضائے ایمان اور دینی فریضہ ہوتا ہے۔ (۴) ہمارے زمانے میں ناموسِ رسالت کو سب سے زیادہ نقصان تحریک "احمدیت" نے پہنچایا اور عظمتِ قرآن کو (نام نہاد) "اہل قرآن" نے۔ (۵) فرقہ اہلِ قرآن کو چنداں اہمیت حاصل نہیں، یہ چند گنتی کے نفوس پر مشتمل ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اب یہ اپنی تحریک کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کا نوٹس لینا بھی ضروری خیال کیا ہے۔ (۶) میرے اس مقالہ کے مخاطب، اس فرقہ کے ذمہ دار افراد نہیں کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ لیڈری کی ہوس انسان میں ایسا پندارِ نفس پیدا کر دیتی ہے جو ان سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے۔ میرے مخاطب وہ سعید افراد ہیں جو ان کی باتوں پر نہایت نیک نیتی سے یہ سمجھ کر کان دھرتے ہیں کہ یہ قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ حقیقت کے سامنے آ جانے کے بعد غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کریں۔ (۷) میرا مقصد لوگوں سے کسی بحث میں الجھنا نہیں کیونکہ اس کے لئے میرے پاس فالتو وقت ہی نہیں۔ نہ ہی میں ذاتیات پر اتروں گا کہ علمی گفتگو میں ذاتیات پر اتر آنا پستی فطرت کی دلیل ہوتا ہے۔ میں ذاتیات پر اترا ہی نہیں کرتا۔ میں اپنی زندگی کے باقی ایام کو خدمتِ قرآن کے تعمیری مقصد کے لئے وقف رکھنا چاہتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف آئیے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو سفرِ حیات میں اس کی راہنمائی بھی اپنے ذمے لی۔ اس راہنمائی کے لئے طریق یہ اختیار کیا گیا کہ خدا اس کا علم، وحی کے ذریعے، ایک برگزیدہ ہستی کو عطا کر دیتا اور وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتی۔ اس برگزیدہ ہستی کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ اس راہنمائی کا انداز کیا تھا، اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ خود انسانی زندگی کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ کس اصول کے تابع باقی رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ یہ اصول ہے ثبات و تغیر کا امتزاج۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے جس کا تعلق انسان کی طبیعی (یعنی جسمانی) زندگی سے ہے۔

ثبات و تغیر کا امتزاج

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی کا دارومدار (منجملہ دیگر عوامل) غذا پر ہے۔ اسے زندگی کے پہلے سانس سے لے کر نفسِ آخرین تک غذا کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس غذا کی نوعیت اور طور طریق حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ زمان کے اعتبار سے دیکھئے تو تاریخ کے دورِ اولیں کے جنگلوں اور غاروں میں بسنے والے انسانوں کی غذا کی نوعیت کچھ اور تھی اور عصرِ حاضر کے انسان کی کچھ اور۔ پھر ایک ہی فرد کی عمر کے مختلف ادوار اور جسمانی حالت کو سامنے رکھئے تو اس کی غذا کی نوعیت میں تغیر ضروری ہو گا۔ پیدائش کے بعد بچے کی غذا صرف دودھ ہوتی ہے۔ پھر کوئی زود ہضم غذا۔ جوانی میں غذا اور مقدار کی ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں اور مقدار کی۔ صحت کی حالت میں اس کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے بیماری کی حالت میں کچھ اور۔ ان تمام حالات میں آپ نے دیکھا کہ وہ اصول (کہ زندگی کا دارومدار غذا پر ہے) شروع سے آخر تک غیر متغیر رہتا ہے لیکن اس اصول کے کارفرما ہونے کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ اسے کہا جاتا ہے ثبات اور تغیر کا امتزاج۔ نہ یہ اصول تغیر پذیر ہو سکتا ہے اور نہ اس پر عمل ہونے کے طور طریق غیر متغیر۔ اگر غذا کی نوعیت اور اس کے طور طریق بھی غیر متغیر قرار دیئے جائیں تو زندگی چار قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

جو اصول انسان کی طبیعی زندگی کو محیط ہے، اسی کے مطابق اس کی انسانی اور عمرانی زندگی بھی رواں دواں رہ سکتی ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ کچھ اصول ہوں غیر متغیر اور ان اصولوں کی کارفرمائی کے لئے طور طریق ہوں جو حالات کے ساتھ بدلتے رہیں۔ خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے جو راہنمائی ملتی رہی اس کا انداز بھی یہی تھا۔ اس کے اصول تو شروع سے آخر تک غیر متبدل رہے لیکن ان اصولوں کی کارفرمائی کے طور طریق تغیرِ حالات کے تحت بدلتے رہے۔ ان بدلتے ہوئے طور طریق کو ان اصولوں کی جزئیات کہا جاتا ہے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ ہر رسول کا پہلا پیغام یا اعلان یہ ہوتا تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (۵۹/۷) "اے میری قوم! صرف اللہ کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ہستی نہیں جو تمہاری اقتدار ہو؟" یہ دین کا اصل الاصول اور بنیادِ محکم تھی۔ یہی وہ دین کی اصل تھی جو شروع سے آخر تک ایک ہی رہی اور غیر متبدل رہی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲/۱۳)

ہم نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا گیا تھا اور جناب (اے رسولؐ!)

تیری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ (اس دین کو) حکم اور استوار رکھو اور اس میں تفرقہ مت پیدا ہونے دو۔

یہ تھا دین کا ناقابلِ تغیر و تبدل اصول۔ جہاں تک اس اصول کو بروئے کار لانے کا تعلق ہے (یعنی دین کی جزئیات) سو شروع شروع میں چونکہ انسانی علم بڑا محدود تھا اس لئے وہ بھی بالعموم خدا ہی کی طرف سے عطا ہوتی تھیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے زمانے میں انسانوں کو دیا کم از کم اس خطۂ زمین کے لوگوں کو کشتی بنانے کا ہنر بھی نہیں آتا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ طریق بھی وحی کے ذریعے بتایا گیا جب ان سے کہا گیا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (۱۱/۳۷)۔ تو ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا۔ جوں جوں انسانی علم بڑھتا گیا، وحی کے ذریعے جزئیات متعین کرنے کی ضرورت کم ہوتی گئی۔ چنانچہ ہمارے رسول کے زمانے میں، یہ دیکھا جاتا رہا کہ سابقہ جزئیات میں سے کون کون سی ایسی ہیں جن کی ضرورت باقی نہیں رہی یا جن میں تغیر و تبدل ضروری ہو گیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶)۔ یعنی وحی کا انداز یہ رہا ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا۔ اور یہ نئے احکام پہلے احکام سے بہتر ہوتے۔ جن سابقہ احکام کا عملی حالہ رکھا جانا مقصود ہوتا۔ خواہ وہ اس رسول کی امت کے پاس ہوں یا اس نے انہیں فراموش کر دیا ہو۔ ان کی جگہ انہی جیسے احکام جدید وحی میں دیئے جاتے یعنی اصولی احکام غیر متبدل رہتے اور ان کی جزئیات میں بہ تقاضائے حالات تغیر و تبدل ہوتا رہتا۔

خدا کی آخری وحی

خدا کی طرف سے ملنے والی راہنمائی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ تا آنکہ وہ زمانہ آگیا جب مشیتِ خداوندی نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ وحی کی رو سے دیا جانا مقصود ہے اسے آخری مرتبہ دے دیا جائے اور اس کے بعد سلسلۂ وحی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ وحی، جو قیامت تک تمام نوعِ انسان کی راہنمائی کے لئے کافی سمجھی گئی، قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دی گئی۔ چونکہ زمانہ وہ آچکا تھا جب علم انسانی بڑی تیزی سے ترقی کرتا چلا جانا تھا۔ اور خدا کے علم میں تھا کہ یہ اسی سرعت کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لئے اس آخری وحی میں غیر متبدل اصول تو تمام کے تمام دے دیئے گئے لیکن ان کی جزئیات بہت کم دی گئیں۔ یہ اس لئے کہ اگر جزئیات بھی تمام کی تمام وحی کے ذریعے دے دی جاتیں تو وہ بھی قیامت تک کے تمام اقوامِ عالم کے لئے غیر متبدل قرار پا جاتیں۔ لیکن جب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتیں تو دین پر عمل پیرا ہونا مشکل (بلکہ بعض حالات میں) ناممکن ہو جاتا۔ ان جزئیات میں تغیر اس لئے نہ ہو سکتا کہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ لہٰذا دین کے ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل رہنے کا طریق یہی تھا کہ ان اصولوں کی وہی جزئیات بذریعۂ وحی دی جائیں جن میں تغیر کی ضرورت نہ پڑتی۔ قابلِ تغیر جزئیات وحی کے ذریعے دی ہی نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ نمائی کو اس طرح قرآن کریم میں محفوظ کر دیا۔ اور اس کے بعد اعلان کر دیا کہ۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۱۱۵)۔ خدا کی بات (دینِ خداوندی) صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اب ان احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اُس خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو کچھ قرآن میں نہیں دیا گیا تھا اس کے متعلق تاکید سے کہہ دیا کہ تم ان کی بابت خواہ مخواہ کرید اور کاوش مت کرو کہ وہ کیوں نہیں بتایا گیا۔ خدا کا یہ پروگرام ہی تھا کہ انہیں وحی کے ذریعے متعین نہ کر دیا جائے۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو کل کو جب ان میں تغیر کی ضرورت پڑتی تو تم مشکل میں پھنس جاتے کہ ان پر عمل کرنا ناممکن ہو جاتا اور ان میں تم تبدیلی کر نہ سکتے کیونکہ خدا کے متعین کردہ احکام میں تبدیلی تو صرف خدا کی وحی ہی کر سکتی تھی اور وحی کا سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ جو کچھ قرآن میں دیا گیا ہے، وہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ جو اس میں نہیں دیا گیا وہ غیر متبدل نہیں۔

(دیکھئے سورۃ مائدہ - آیات ۱۰۱-۱۰۲)

جزئیات کا تعین کیسے ہو؟

یہاں سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام کی تمام جزئیات قرآن کے اندر نہیں دی گئیں تو باقی ماندہ قابلِ تغیر جزئیات کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا اور کون ایسا کرنے کا مجاز ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کی ضرورت کسی ایک زمانے میں بھی لاحق ہوگی اور پھر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت بھی لاحق ہوتی رہے گی۔ اس کے لئے کیا کیا جائے؟ اس کا جواب خود خدا نے دے دیا (اور اسے ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا)۔ اس نے کہا کہ دینِ خداوندی (اسلام) کی ایک نظام کی شکل میں کارفرما ہوگا۔ اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں مملکت یا نظامِ حکومت کہا جائیگا اس نظام کا انداز مشاورتی ہوگا۔ اور ان جزئیات کا تعین یا ان میں تغیر و تبدل اس نظام کی طرف سے ہوگا۔ اس نظام کے اولین سربراہ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ چنانچہ حضورؐ سے فرمایا گیا کہ:۔ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۸)۔ یہ امور باہمی مشورہ سے طے کیا کرو۔ چنانچہ عہدِ رسالتمآبؐ میں ان جزئیات کا تعین اسی طریق سے ہوتا رہا۔ واضح ہے کہ مقصود بالذات تو دین کے اصولوں پر عمل پیرا رہنا یا انہیں نافذ کرنا تھا۔ یہ جزئیات ان اصولوں کی تنفیذ کا ذریعہ تھیں اس لئے یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ یہ جزئیات ان اصولوں سے کسی طرح بھی ٹکرائیں۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ یہ جزئیات قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے طے پاتی تھیں۔

یہ کچھ تو رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ میں ہوتا رہا۔ اس کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی دنیا سے تشریف برداری کے بعد کیا طریق اختیار کرنا مقصود تھا۔ اس کے لئے بھی قرآن کریم میں واضح راہنمائی دے دی گئی جب کہا گیا کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ
أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ

فَلَنْ تَضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس کے نہیں کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ سو، اگر یہ (کل کو) وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام تو حضورؐ کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہ نہیں رہے تو نظام بھی ختم ہو گیا)، پھر اپنے قدیم مسلک کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ جو ایسا کرے گا وہ خدا کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا (خود اپنا ہی نقصان کرے گا) لیکن جو اس نظام کی قدر دانی کرے گا تو اللہ اسے اس کا بدلہ دے گا۔

یعنی، یہ بتا دیا گیا کہ دین کا یہ نظام رسول اللہؐ کی ذات تک محدود نہیں۔ یہ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے گا اور ان جزئیات کے تعین یا ان میں عند الضرورت تغیر و تبدل کے لئے طریق کار بھی وہی اختیار کیا جائے گا جس کا حکم خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا یعنی۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) یہ بھی ان امور کو باہمی مشاورت سے طے کریں گے"۔ چنانچہ حضورؐ کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور قائم رہا۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت یا خلافتِ راشدہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں دین کی نئی جزئیات کا بھی تعین ہوا۔ اور جن سابقہ جزئیات میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس ہوئی ان میں تغیر و تبدل بھی کیا گیا۔ اگرچہ اس کی ضرورت بہت کم مواقع پر پیش آئی۔ کیونکہ وہ زمانہ کچھ ایسا لمبا نہیں تھا۔ چند سالوں پر مشتمل تھا۔

(۰)

خلافتِ راشدہ کے بعد

کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا، اور قرآن کریم نے جو پہلے وارننگ دی تھی کہ "کیا تم پھر اپنے سابقہ مسلک کی طرف پلٹ جاؤ گے"۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ اور اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی انسانی معاملات دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ وہ جن کا تعلق امورِ دنیا سے سمجھا گیا اور دوسرا وہ جسے مذہبی امور کہہ کر پکارا گیا۔ یہی وہ "قدیم مسلک" تھا جس کے متعلق وارننگ دی گئی تھی کہ تم کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ اب امورِ مملکت (یعنی دنیاوی امور) سلاطین نے سنبھال لئے اور مذہبی امور مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں آ گئے۔ سلاطین کے لئے تو آسان تھا کہ وہ جس طرح بھی چاہتے اپنے احکام نافذ کرتے۔ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ مسئلہ دقت طلب ہو گیا کہ مذہبی امور کے فیصلوں کے سلسلہ میں کیا طریق عمل اختیار کیا جائے۔ مشاورت کا تو مذہب میں تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن میں جہاں شوریٰ کا حکم دیا گیا تھا اس کی تاویل یوں کر لی گئی کہ اس کا تعلق امورِ دنیا سے ہے مذہبی امور سے نہیں۔ مذہبی امور کے لئے "شریعت" کی اصطلاح اختیار کی گئی اور کہا یہ گیا کہ اعتقادات اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل دائرہ شریعت میں آتے ہیں۔ دین کے نظام میں، ہر دنیاوی کام جو احکامِ خداوندی کے مطابق سرانجام دیا جاتا، عبادت (یعنی خدا کی حکومیت) کہلاتا تھا۔ اب عبادت کا مفہوم

پرستش قرار پا گیا اور اس کا بنیادی امور سے کوئی تعلق نہ رہا۔

روایات کے مجموعے

ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ سوال غور طلب تھا کہ جو امور ان کے دائرہ اقتدار میں دے دیئے گئے ہیں ان کے متعلق فیصلے کس طرح کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان امور کی جزئیات نہ تمام کی تمام قرآن مجید کے اندر موجود تھیں اور نہ ہی دین کا نظام باقی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جس دور میں دین کا نظام قائم تھا (یعنی عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ) اس میں نافذ العمل جزئیات کا کوئی مستند مجموعہ تحریری طور پر امت کے پاس موجود نہیں تھا۔ بنا بریں، اس کے سوا کوئی شکل نہیں تھی کہ جو کچھ لوگوں کی زبانی معلوم ہو، اسے جمع، مدون اور مرتب کر دیا جائے۔ یوں روایات کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ اور جو جزئیات ان میں ملیں انہیں احکامِ شریعت قرار دے کر ۔۔۔۔۔ امت کے لئے واجب العمل ٹھہرا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو روایات اس طریق سے جمع ہوئی تھیں ان میں بہت سے اختلافات اور تضادات تھے۔ ان اختلافات کی بنا پر امت میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آ گئے۔ بالخصوص اس لئے کہ بے شمار روایات خود وضع کر کے انہیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا تھا۔

فقہ

اس حد تک تو ان روایات نے کام دے دیا لیکن زمانے کے تقاضے تو کسی مقام پر رک نہیں سکتے۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور ان کے لئے نئی جزئیات کی ضرورت پڑتی گئی۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ اب کیا کیا جائے؟ فقہاء نے اس کا حل یہ سوچا کہ جو کچھ شریعت کے نام سے موجود تھا اس پر غور و فکر کے بعد ایسے احکام مستنبط کئے جائیں جو زمانے کے ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ استنباطِ مسائل کے اس طریق کو اجتہاد کہا جاتا ہے اور جو احکام اس طرح مستنبط ہوں وہ فقہ کہلاتی ہے۔ چونکہ فقہ بھی ذاتی طور پر مستنبط اور مرتب ہوئی تھی (یعنی نظام کی طرف سے نہیں بلکہ مختلف ائمہ فقہ نے اسے ذاتی طور پر مرتب کیا تھا)۔ اس لئے اس میں بھی اختلاف فطری امر تھا۔ یوں امت میں مزید فرقے پیدا ہو گئے۔ کچھ وقت کے بعد یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اجتہاد کی رو سے بھی جس قدر فیصلے کئے جانے مقصود تھے وہ سب کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا اب مزید اجتہاد کا دروازہ بھی بند ہے۔ امت پر یہ جمود صدیوں سے طاری ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دین کے نظام کے باقی نہ رہنے سے اسلام کیا سے کیا ہو گیا؟۔ وحی کا دروازہ خدا نے بند کیا تھا۔ روایات جمع اور مرتب ہو گئیں تو یہ سلسلہ بھی آخری حد تک پہنچ گیا۔ کچھ آگے بڑھنے کے لئے اجتہاد کا طریق اختیار کیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد اس کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ یہ امت فرقوں میں بٹ گئی، اور قرآن کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو گئی کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۲) ہر فرقہ مگن ہو کر بیٹھ گیا کہ "سچے اسلام پر وہی کاربند ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں" حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ

"سچا اسلام" کہیں بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سچے اسلام کے معنی تھے ایک امت ــ اس کا ایک نظام ــ نظام کی ایک مرکزی اتھارٹی، جو باہمی مشاورت سے احکامِ خداوندی کو نافذ کرتی، جو ان جزئیات کا تعین کرتی جو قرآن میں نہیں تھیں۔ ان میں عندالضرورت اضافہ بھی کرتی اور تغیر و تبدل بھی۔ اس نظام کے ذریعے سے امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسی تشتت و انتشار کی طغیانیوں اور فقدانِ مرکزیت کی تباہ کن حیرانیوں میں صدیوں سے امت گرفتار چلی آرہی ہے۔ اس سے بعض (دین کی حقیقت سے ناآشنا ذہن) اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ وحی کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض لوگ خود مدعی نبوت بن بیٹھے۔

اسی پریشانی فکر و نظر کا پیدا کردہ وہ فرقہ ہے جو حال ہی کے زمانے میں پنجاب میں نمودار ہوا اور اہل قرآن کے نام سے متعارف ہے۔ اسے اتفاق کہیئے یا اہل پنجاب کی بدقسمتی کہ اہل قرآن اور احمدی دونوں خطۂ پنجاب سے نمودار ہوئے اور کم و بیش ایک ہی وقت میں۔ یہ دونوں دین کے بحیثیت نظام کے تصور سے ناآشنا اور اسے ایک "مذہب" سمجھتے تھے (اور سمجھتے ہیں)۔

——— (۰) ———

فرقہ اہل قرآن

فرقہ اہل قرآن کے بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) تھے۔ مرزا غلام احمد کے متعلق تو معلوم ہے کہ ان کی دعوت حکومت برطانیہ کی مقاصد برآری کا ذریعہ تھی اور اس لئے اسی کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا۔ لیکن (مولانا) چکڑالوی کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت نیک تھی اور دل میں اسلام کا درد۔ انہوں نے دیکھا کہ فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ فرقہ بندی کے متعلق انہیں معلوم تھا کہ اس کی بنیاد بالواسطہ یا بلاواسطہ روایات پر ہے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو قرآن پر جمع کیا جائے۔ یہاں تک تو بات صحیح بھی تھی اور صاف بھی۔ لیکن اس سے آگے بڑھے تو انہیں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے خارج از قرآن کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اس طرح انہوں نے احادیث (اور ان پر متفرع فقہ) کو بالکلیہ مسترد کر دیا۔ اس پر مولوی صاحبان کی طرف سے سب سے پہلے وہ اعتراض وارد کیا گیا جسے وہ "اسلام کے دین سے مذہب میں تبدیل ہو جانے کے زمانے سے وارد کرتے چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا کہ اگر اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے قرآن کافی ہے تو یہ بتلائیے کہ ہم نماز کیسے پڑھیں؟ اسلام (بحیثیت ایک نظام) کا تصور (مولانا) چکڑالوی کے سامنے تھا نہیں۔ جس طرح معترضین اسے ایک مذہب سمجھتے تھے اسی طرح یہ بھی اسے ایک مذہب ہی خیال کرتے تھے۔ لہٰذا انہیں ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ قرآن سے نماز کی جملہ جزئیات نکالیں۔ اس لئے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے نماز کی حقیقت، ماہیت، کیفیت، کمیت، جزئیت وغیرہ

یعنی جملہ افعال واذکار، حرکات وسکنات وغیرہ وغیرہ تمام امورات متعلقہ نماز
بہ تفصیل و توضیح و تشریح قرآن مجید ہی میں بیان فرما دیئے ہیں۔

(ترجمۃ القرآن - پارہ دوم - صفحہ ۲۰۷)

چکڑالوی صاحب نے قرآن کریم میں نماز کی جملہ حرکات وسکنات وافعال واذکار کی تلاش شروع کر دی۔ وہ صرف ونحو کے عالم نظر آتے ہیں اور قرآنی آیات پر بھی انہیں عبور دکھائی دیتا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ قرآن کے سمندر میں ان موتیوں کی تلاش میں غوطہ زن ہوتے جو وہاں موجود نہیں تھے۔ اس میں شناوری، غیر موجود کو موجود کیسے بنا سکتی تھی۔ لہٰذا وہ لگے ٹامک ٹوئیاں ملنے۔ فی طغیانہم یعمہون۔ اس سعی ناکام میں انہیں جس کھینچا تانی سے کام لینا، اور اس کی وجہ سے جس اضطراب وہیجان سے کہ چڑچڑاہٹ اور جھنجلاہٹ کا شکار ہونا پڑا، وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ بات چونکہ مناظرانہ دعویٰ کی تھی، اس لئے اعتراف شکست بھی ممکن نہیں تھا۔ اس طرح یہ جانِ مجنوں، دوگونہ عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ انہوں نے بزعم خویش، جو کچھ قرآن سے ثابت کیا، وہ پانچ وقتوں کی نماز، نماز کی دو، تین اور چار رکعتیں اور ہر رکعت میں دو سجدے تھے۔ یعنی مروجہ نماز ہی کے ارکان۔ لیکن ان کے ثابت کرنے کا انداز اس قدر رکیک تھا کہ اس پر عقل شرمائے اور علم ماتم کرے۔ مثلاً وہ رکعتوں کی تعداد کے سلسلہ میں "یہ تحقیق انیق" پیش فرماتے ہیں کہ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۳۵/۱)

اس کا سیدھا سادھا ترجمہ یہ ہے۔

سب خوبی اللہ تعالیٰ کو ہے جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام لانے والے۔ جن کے پر ہیں دو۔ دو اور تین تین اور چار چار۔"

(ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

(مولانا) چکڑالوی اس کا حسب ذیل ترجمہ لکھتے ہیں۔

پڑھا کرو اے ہر ایک اہل آسمان واہل زمین۔ الحمد (یعنی پانچوں نمازیں) واسطے راضی کرنے اللہ تعالیٰ کے کیونکہ وہ فطرت پاک کرنے والا ہے۔ تم تمام آسمان والوں (فرشتوں کی) اور تم تمام نچلے زمین والوں (جن وانس کی)۔ چونکہ تم فطرت اللہ میں تغیر وتبدیل کرتے رہتے ہو اس لئے نمازیں پڑھا کرو تاکہ جبر نقصان ہوتا رہے۔ اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمہاری طرف۔ جو لانے والے ہیں تمہاری صلواتوں یعنی چہار ارکانوں کے ہیں۔ جن کا حق یہ ہے کہ کسی وقت میں دو دو بار ادا کی جائیں اور کسی وقت میں تین تین اور کسی وقت میں چار چار دفعہ مطابق تعلیم کتاب اللہ۔ (یعنی جس وقت کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ ادا کرنے کا حکم فرمایا، تم بھی اس وقت ان چہار ارکان کو دو ہی بار پڑھا کرو۔ اور جس وقت ان کو

تین بار ادا کرنے کا حکم دیا ہے، تم بھی اس وقت میں ان کو تین ہی بار ادا کیا کرو۔ اور جس وقت
میں فاطر السمٰوٰت والارض نے تم کو چار بار ان کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس وقت چار بار
پڑھا کرو۔　　　(ترجمۃ القرآن۔ پارہ پانچ صفحہ ۴۷)

اور اس کے بعد پانچ چھ صفحات میں قرآن کریم کی مختلف آیات اور ان کی (اپنی) تشریح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ
دیکھو) اس بات کا قطعی اور یقینی فیصلہ کرنا ہے کہ نماز کی رکعتیں اس طرح ہیں کہ فجر کی دو، شام
کی تین، ظہر و عصر و عشاء میں سے ہر ایک کی چار۔　　　(ایضاً صفحہ ۵۳)

آپ غور کیجئے کہ یہ قرآن کے ساتھ (معاذ اللہ) کھلا ہوا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

یا (مثلاً) انہوں نے قرآن سے (بانداز بالا) یہ ثابت کیا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔
اس طرح کہ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف گئے تو چونکہ معرکہ بڑا صبر آزما تھا
اس لئے ان سے کہا گیا کہ وہاں کسی سے ڈرنا نہیں، مضطرب و بیقرار نہیں ہونا۔ پوری دلجمعی اور اطمینان سے اپنی بات
پیش کرنا۔ اس کے لئے الفاظ یہ استعمال کئے گئے کہ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ۔ (۲۸)
یعنی خوف کی حالت میں گھبرانا نہیں بلکہ اپنے بازو سمیٹ لینا۔ (مولانا) چکڑالوی فرماتے ہیں کہ
اس سے ثابت ہوا کہ حکم خداوندی یہ ہے کہ نماز میں اپنے ہاتھ کہنیوں تک ایک دوسرے
کے اوپر جمع کر کے اپنے سینے کے ساتھ ملاؤ۔　　　(ترجمۃ القرآن۔ پارہ ۲۔ صفحہ ۱۲۸)

غرضیکہ وہ اسی طرح نماز کی جملہ جزئیات قرآن کریم سے "ثابت" کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ اس طرح "ثابت"
کرتے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کتاب اللہ کی سراسر مخالفت
ہے" (ایضاً۔ پارہ ۳۔ صفحہ ۱۰۴) — ان الفاظ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ان سے ایک اہم نتیجہ
سامنے آئے گا۔

حرکات و سکنات کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ نماز میں پڑھنا کیا چاہیئے۔ اس میں سوائے سورۃ فاتحہ کے سب
کچھ مروجہ نماز سے مختلف ہے، اگرچہ وہ ہیں قرآن ہی کی آیات۔

ایک اہلحدیث کا لقمہ

یہ ہے وہ طریق جس سے چکڑالوی صاحب نے نماز اور اسی طرح قرآن کریم کے دیگر اصولی احکام کی جزئیات
قرآن سے "ثابت" کیں۔ جب قرآن سے اثبات و تعیین احکام کا انداز یہ ٹھہرا تو پھر اس میں کوئی روک کس
طرح پیدا ہو سکتی تھی؟ چنانچہ خود (مولانا) چکڑالوی کی (غالباً) زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد انہی کے ہم خیال
ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنا شروع کر دیں۔ مثلاً امکران کے مولوی محمد پنیال
اور مولوی محمد عالم۔ گوجرانوالہ کے مولوی محمد رمضان، اکال گڑھ کے مولوی حبر اغدین وغیرہ۔ ان میں سے کسی
نے ایک وقت کی نماز اور ہر نماز کی ایک رکعت بتائی۔ کسی نے تین دن کے روزے اور کسی نے نو دن کے۔
کسی نے فلاں چیز کو حلال قرار دیا اور کسی نے فلاں کو حرام۔ غرضیکہ ان کی ان کوششوں سے خدا کی اس کتاب عظیم

کی (معاذ اللہ) اس طرح دھجیاں فضا میں بکھریں کہ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی کی بات پر بھی لوگوں نے دھیان نہ دیا۔ ورنہ جتنے فرقے، بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں میں اس وقت موجود ہیں ان سے کہیں زیادہ اس ایک نظریہ سے پیدا ہو جاتے۔ ان میں سے صرف ایک گروہ (جو معدودے چند نفوس پر مشتمل ہے) اس وقت تک موجود ہے جس کا تعارف ان کے ترجمان ماہنامہ بلاغ القرآن کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سمن آباد (لاہور) میں ان کی ایک ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد ہے جس میں وہ (بزعم خویش) تین وقت کی "قرآنی نمازیں" پڑھتے ہیں۔ ان تین نمازوں کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ مولانا چکڑالوی نے قرآن کریم سے پانچ وقت کی نمازیں ثابت کی تھیں۔ وزیر آباد (ضلع گجرات) کے ایک اہلحدیث عالم حافظ عنایت اللہ صاحب نے ان کی تردید کی اور کہا کہ قرآن مجید سے تو صرف تین وقتوں کی نمازیں ثابت ہوتی ہیں۔ آپ پانچ وقتوں کی کس طرح ثابت کرتے ہیں۔ یہ (مولانا) چکڑالوی کی زندگی کے آخری ایام کی بات ہے۔ انہوں نے تو اپنے خیال سے رجوع نہ کیا لیکن ان کے بعد ان کے متبعین کے لاہوری گروہ نے حافظ عنایت اللہ صاحب کی بات اچک لی اور کہا کہ قرآن کی رو سے نمازیں تین ہی ہیں۔ ادارہ بلاغ القرآن کی طرف سے "الصلوٰۃ" کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے (چکڑالوی صاحب کے طریق کے مطابق) ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے :-

(۱) نمازوں کی تعداد تین ہے۔ (چکڑالوی صاحب نے پانچ نمازیں بتائی تھیں)

(۲) ہر نماز کی صرف دو رکعتیں ہیں۔ (چکڑالوی صاحب نے دو، تین، چار رکعتیں کہی تھیں)

(۳) ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ ہے (چکڑالوی صاحب نے ہر رکعت میں دو سجدے بتلائے تھے)

(۴) نماز کے لئے اذان کی ضرورت نہیں۔

(۵) اللہ اکبر کہنا خلافِ قرآن ہے۔

(۶) السلام علیکم کے بجائے سلامٌ علیکم کہنا چاہیے۔

نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے یہ بھی قائل ہیں لیکن اس کا اثبات سورۃ الکوثر کی اس آیت سے کرتے ہیں۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ (۱۰۸/۲) جس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "پس اپنے رب کے حضور میں نماز ادا کیا کر اور سینے پر ہاتھ باندھ کر قبلہ رو کھڑا ہوا کر۔" (پمفلٹ مذکور ص۱)۔ مولانا چکڑالوی کی طرح ان کا بھی یہ دعوٰے ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ قرآن کریم کا قطعی فیصلہ ہے (ایضاً ص۲۲)۔ اس کے خلاف کچھ ثابت کرنا "صریحاً خلاف قرآن" ہے۔ (ایضاً ص۲۹)۔ خدا نے اپنی تنزیلی کتاب میں یہی حکم دیا ہے۔ (بلاغ القرآن بابت دسمبر ۱۹۷۲ء، صفحہ ۳۲)۔ جہاں تک اذکارِ صلوٰۃ کا تعلق ہے، دعائے قبل الصلوٰۃ سے لے کر سلام تک ان کی نماز بھی (بجز سورۃ فاتحہ) باقی مسلمانوں کی نماز سے بالکل الگ ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ رکوع میں یہ دعا پڑھنی چاہیے۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ

اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ۔ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ

انی من المسلمین ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔
ربنا لا تجعلنا فتنۃ اللذین کفروا۔ واغفرلنا۔ انک انت العزیز
الحکیم

اور سجدہ میں یہ دعا:۔

سبحٰن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا۔ الحمد للہ الذی لم یتخذ
ولدا ولم یکن لہٗ شریک فی الملک ولم یکن لہٗ ولی من الذل
ربنا اصرف عنا عذاب جہنم ان عذابہا کان غراما۔ انہا ساءت
مستقرا و مقاما۔ ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریٰتنا قرۃ اعین
واجعلنا للمتقین اماما　　　　(پمفلٹ مذکور ص۸)

اسی قسم کے دیگر اذکار ہیں۔

(۱)

قرآن کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانیوالے

میں کہتا چلا آرہا ہوں اور اسے اب پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے قرآن کو سب سے زیادہ نقصان اس فرقہ نے پہنچایا ہے۔ سطح بین نگاہوں میں میری یہ بات بڑی عجیب انگیز سی دکھائی دے گی کیونکہ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ جو لوگ دین کے معاملہ میں قرآن کو کافی تسلیم کرتے ہیں اور ہربات کو قرآن ہی سے ثابت کرتے ہیں وہ قرآن کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ لہذا یہ نکتہ ٹھنڈے دل اور گہرے غور اور تدبر سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا
فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کیطرف سے ہوتا
تو یہ لوگ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

یہ آیہ جلیلہ بڑی اہم اور بنیادی ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ہی نہیں بلکہ ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اگر (معاذ اللہ) یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن ایسے احکام دیتا ہے جن میں باہمدگر اختلاف اور تضاد ہے تو اس سے قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے کا دعوےٰ باطل ہو جاتا ہے اور دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔

مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں، اور ان میں باہمی اختلافات بھی، لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ان کے ان اختلافات کی بنیاد قرآن ہے۔ اہل حدیث کے اختلافات کی بنیاد روایات پر ہے۔

حدیث کے متعلق اگرچہ ان کے ہاں یہ عقیدہ بھی موجود ہے کہ ان کی بنیاد وحی خفی پر ہے لیکن اس کے باوجود وہ قال الرسول کو قال اللہ سے الگ رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے اختلافات کی زد براہ راست قرآن کریم پر نہیں پڑتی۔

اہل حدیث سے آگے بڑھیے تو اہل فقہ سامنے آتے ہیں۔ ان کے اختلافات کی بنیاد ان کے ائمہ کا اجتہاد ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ضرور ہے کہ ان کے ائمہ کے اجتہاد کی بنیاد قرآن اور احادیث ہی پر ہے۔ لیکن وہ اسے قال اللہ نہیں کہتے۔ اپنے ائمہ کے اقوال ہی کہتے ہیں۔ لہٰذا فقہی اختلافات کی زد بھی قرآن پر نہیں پڑتی۔

لیکن فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ خدا کا ارشاد ہے۔ وہ قرآن کا حکم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کو ماننے والوں میں سے جب ایک کہتا ہے کہ اس معاملہ کے متعلق قرآن کا حکم یہ ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ اس کا حکم یہ ہے جو پہلے حکم کے خلاف ہے تو اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک ہی معاملہ کے متعلق قرآن مختلف اور متضاد احکام دیتا ہے۔ اس سے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعوےٰ یکسر باطل قرار پا جاتا ہے۔ دیگر احکام کو تو چھوڑیئے، اس فرقہ کے بانی (مولانا چکڑالوی) اور ان کے متبعین (بلاغ القرآن والوں) نے صرف نماز کے متعلق جو قرآنی احکام بتلائے ہیں، وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً:

بلاغ القرآن والوں کے مطابق قرآن نے کہا ہے	مولانا چکڑالوی کے مطابق قرآن نے کہا ہے
(۱) نمازیں تین وقت کی ہیں	(۱) نمازیں پانچ وقت کی ہیں
(۲) ہر نماز کی صرف دو رکعتیں ہیں۔	(۲) نمازوں کی رکعتیں دو دو، تین تین، چار چار ہیں۔
(۳) ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ ہے	(۳) ہر رکعت میں دو سجدے ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ یہ نماز سے متعلق محسوس اور مرئی احکام ہیں جو ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ اور ان دونوں کا دعوےٰ یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایسا کہا ہے۔ جو اس کے خلاف کہتا ہے وہ قرآن کی مخالفت کرتا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے اپنی بصیرت کے مطابق قرآن سے یہ احکام مستنبط کئے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن نے یہ جزئیات خود متعین کی ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جب یہ چیز غیر مسلموں کے سامنے آئے کہ قرآن نے نماز کے تین وقت بھی بتائے ہیں اور پانچ بھی۔ اس نے نماز کی دو رکعتیں بھی مقرر کی ہیں اور فجر کی نماز کی دو، ظہر عصر اور عشاء کی چار اور مغرب کی تین رکعتیں بھی۔ اسی قرآن نے ایک رکعت کے لئے ایک سجدہ مقرر کیا ہے اور اسی نے دو سجدے ۔۔ تو وہ قرآن کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ غیر مسلم تو ایک طرف، جب سمجھنے سوچنے والے مسلمان نوجوانوں کے سامنے بھی یہ بات آئے گی تو ان کا قرآن کریم کے متعلق کیا تصور ہوگا؟ اور یہ تو ابھی ہم نے صرف نماز کے متعلق بتایا ہے۔ دیگر احکام کے متعلق بھی انکی تصریحات سامنے آئیں تو قرآن کے متعلق تصور یہ پیدا ہوگا کہ یہ تو ہے ہی اختلافات کا مجموعہ۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ میں نے جو کہا ہے کہ قرآن کریم کو سب سے زیادہ نقصان اس فرقہ نے

پہنچایا ہے۔ تو اس میں ذرا بھی مبالغہ ہے ؟

اسے ایک دفعہ پھر ذہن نشین کر لیجئے کہ مولانا چکڑالوی اور بلاغ القرآن والے، دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ نماز کی جو جزئیات، خود قرآن کی متعین کردہ ہیں۔ ان کی مستنبط کردہ نہیں، اور صرف نماز کی جزئیات ہی نہیں قرآن کریم نے تمام احکام کی جزئیات خود متعین کر دی ہیں۔ اس کے لئے ان کی سند اور دلیل یہ ہے کہ قرآن نے اپنے آپ کو "مفصل" اور "تفصیل کل شئی" کہا ہے۔ یہ ٹھوکر تھی جو مولانا چکڑالوی کو لگی اور جس کے پیچھے ان کے متبعین آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ قرآن کریم کے "مفصل کتاب" ہونے کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

کتاب مفصل کا صحیح مفہوم

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو کہیں اَلْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵) کہا ہے کہیں تَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ (۱۰/۳۷) اور کہیں تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ (۱۲/۱۱۱) وغیرہ۔ اردو زبان میں تفصیل۔ تفاصیل۔ تفصیلات (جیسے الفاظ) جزئیات کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اور مفصل اسے کہتے ہیں جس میں کسی بات کو مجملاً بیان نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کی جزئیات بھی دی گئی ہوں۔ انگریزی میں انہیں (DETAILS) کہا جاتا ہے۔ (مولانا) چکڑالوی کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ قرآن کریم میں بھی یہ الفاظ انہی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں جن معانی میں یہ اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ بنیادی اینٹ غلط رکھی گئی اس لئے ان کے دعاوی کی دیوار تا ثریا ٹیڑھی ہی چلی گئی۔ عربی زبان میں مادہ (ف۔ ص۔ ل) اور اس سے بننے والے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس میں اس مادہ کے معنی ہیں، "الگ الگ کر دینا"۔ "فصل الحد بین الارضین" کے معنی وہ حدِ فاصل ہے جو زمین کے دو قطعات کو الگ الگ کر دے۔ فصال بچے کے دودھ چھڑانے کو کہتے ہیں۔ یعنی بچے کو ماں سے الگ کر دینے کو۔ فصّل الشاۃ کے معنی ہیں قصاب نے بکری کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تفصیل کے معنی ہیں کپڑے کے ٹکڑے الگ الگ کر دینا۔ فصول السنۃ۔ سال کے چار موسموں (فصلوں) کو کہتے ہیں۔ فاصلۃ۔ اس منکے کو کہتے ہیں جو ہار میں پروئے ہوئے دو موتیوں کے درمیان پرو دیا جائے تاکہ اس سے وہ دو موتی الگ الگ متمیز ہو جائیں۔ ایسے ہار کو عقد مفصل کہا جاتا ہے۔ الفاصل، جج کو کہتے ہیں اور فیصلہ اس کے اس حکم کو جو جائز اور ناجائز، حق اور باطل، غلط اور صحیح کو الگ الگ کر دے۔ فاصلہ، دو مقامات کو الگ کر دیتا ہے۔ (یہ تمام معانی عربی زبان کی مستند کتب لغت میں موجود ہیں)

اس مادہ کے ان معانی کے لحاظ سے تفصیل کے معنی ہیں، واضح کر دینا۔ کھول کر بیان کر دینا (امام راغب) اور مفصل کے معنی، وہ کتاب جس میں ہر بات نہایت وضاحت سے نکھار کر، الگ الگ کر کے، بیان کی جائے۔ جس کے بیان میں کوئی ابہام نہ ہو۔ التباس نہ ہو۔ الجھن نہ ہو۔ ہر بات نہایت واضح، نکھری اور ابھری ہوئی ہو۔ انگریزی میں اسے کہیں گے (DISTINCTLY STATED)۔ واضح ہے کہ قرآن کریم میں

وضاحت یا واضح (یا اس مادہ سے اور الفاظ) نہیں آتے۔ اس میں وضاحت یا واضح کے لئے تفصیل یا مفصل (وغیرہ) الفاظ آتے ہیں۔

ان تشریحات کے بعد قرآن کریم کی طرف آئیے۔ اس میں اس مادہ (ف۔ ص۔ ل) کے الفاظ حسبِ ذیل معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(۱) وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ۔ (۱۲/۹۴) جب قافلہ وہاں سے روانہ (جدا) ہوا۔

(۲) فِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ۔ (۳۱/۱۴)۔ بچے کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے۔

(۳) اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (۲۲/۱۷ و دیگر مقامات)۔ اللہ تعالیٰ ان میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔

(۴) يَوْمُ الْفَصْلِ۔ (۳۷/۲۱ و دیگر مقامات)۔ فیصلہ کا دن

(۵) قَوْلٌ فَصْلٌ۔ (۸۶/۱۳)۔ فیصلہ کن بات۔

(۶) هُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ۔ (۶/۵۷) خدا بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۷) سورۂ انعام میں کارگہِ کائنات کے مختلف عوامل وعناصر کی تگ و تاز کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶/۹۸ ؛ ۶/۹۹)۔ ہم نے اپنی آیات کی وضاحت، ان لوگوں کے لئے کر دی ہے جو علم وبصیرت سے کام لیں۔

(۸) اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کفر اور اسلام قبول کرنے کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بعد فرمایا۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ۔ (۶/۱۲۷) ہم نے ان آیات کو اس قوم کے لئے واضح کر دیا ہے جو (خدائی راہنمائی کو) اپنے سامنے رکھنا چاہے۔

(۹) سورۂ اعراف میں اہلِ جنت اور جہنم کے اصولی امتیازات کی وضاحت کے بعد کہا۔ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔۔۔۔ (۷/۵۲)۔ ہم ان کی طرف وہ کتاب لائے ہیں جسے ہم نے از روئے علم واضح کیا ہے۔

(۱۰) سورہ اسرائیل میں گردشِ لیل و نہار اور عدد السنین (سالوں کی گنتی) وغیرہ بیان کرنے کے بعد کہا۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا۔ (۱۷/۱۲)۔ اور ہم نے ہر شے کی خوب خوب وضاحت کر دی ہے۔

(۱۱) اسی طرح دیگر مختلف مقامات پر اپنی تعلیم کو واضح طور پر بیان کر دینے کے بعد فرمایا۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ۔ (۶/۵۵ ؛ ۷/۳۲ ؛ ۷/۱۷۴ ؛ ۹/۱۱ ؛ ۱۰/۲۴ ؛ ۳۰/۲۸ ؛ ۱/۱۵ ؛ ۱۳/۲)۔ ان آیات میں احکام کی جزئیات کہیں بھی نہیں آئیں۔ ان کی وضاحت ہی کی گئی ہے۔

(۱۲) ان معانی کی روشنی میں سورۃ ھود کی پہلی آیت (۱۱/۱) کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔ وہ کتاب جس کے احکام کو نہایت محکم بنایا گیا ہے اور ان کی وضاحت خود خدا کی طرف سے کر دی گئی ہے۔

(۱۳) سورۂ حٰمٓ السجدہ میں قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (واضح اور فصیح قرآن) کے ساتھ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ۔ (۴۱/۳) آیا ہے۔

مطلب بالکل واضح ہے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (۴۱/۴۴)۔ اگر ہم اسے عجمی زبان میں نازل کرتے تو یہ اعتراض کر دیتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں کی گئیں۔ یہاں فُصِّلَتْ کا مفہوم نکھر کر سامنے آگیا ہے۔

(۴) سورۃ صٓ میں ہے کہ (حضرت) داؤدؑ کو حکمت عطا کی گئی اور فَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰) معاملات کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔

(۵) سورۃ شوریٰ میں كَلِمَةُ الْفَصْلِ (۴۲/۲۱) آیا ہے جس کے معنی ہیں فیصلہ کن بات۔

(۶) سورۃ یونس میں قرآن کریم کے متعلق ہے۔ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ (۱۰/۳۷) اس کے معنی صاف ہیں۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی وضاحت کرنے والی۔ سورۃ یوسف میں ہے تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (۱۲/۱۱۱) یعنی جتنی باتیں اس میں کہی گئی ہیں، سب واضح اور نکھری ہوئی ہیں۔ ان میں کوئی ابہام نہیں۔ سورۃ انعام میں بھی الفاظ کتاب ہونے کے متعلق آتے ہیں۔ (۶/۹۸ نیز ۶/۱۲۶ بھی)

(۷) سورۃ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کو دی گئی نشانیوں کو اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ کہہ کر پکارا گیا ہے (۷/۱۳۳)، یعنی وہ نشانیاں جو حق کو باطل سے الگ کر کے بتا دیں۔

(۸) ان آیات کے بعد، آخر میں سورۃ انعام کی اس آیت کو سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۴)۔ کیا میں خدا کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کی تلاش کروں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے جو اپنے مطالب میں بالکل واضح ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) کہہ کر کر دی۔ یعنی یہ کتاب مبین بھی ہے یعنی اپنے مطالب کو اجاگر کر کے بیان کرنے والی، اور مفصل بھی۔ یعنی انہیں نکھار کر بیان کرنے والی (CLEARLY AND DISTINCTLY) بیان کرنے والی۔ (مولانا محمود الحسنؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی بنا پر (کتاب مفصل) کا ترجمہ "کتاب واضح" کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ترجمہ "کھول کھول کر باتیں بیان کرنے والی" کیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے "واضح کردہ شدہ" کیا ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ خود مولانا عبداللہ چکڑالوی نے اس کا ترجمہ "بالکل واضح اور روشن کتاب" کیا ہے۔ ہم اردو زبان میں انتہائی وضاحت کے لئے کہتے ہیں کہ "وہ ایک ایک لفظ الگ بولتا ہے"۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ (مولانا) چکڑالوی کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کریم کے "کتاب مفصل" ہونے کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ اس میں دین کے تمام اصولی احکام کی جزئیات (اور تفاصیل) بھی دی ہوئی ہیں۔ اس سے ان کی سوچ کی گاڑی غلط پٹڑی پر پڑ گئی اور جب مولویوں کے ساتھ ان کے مناظرے شروع ہو گئے تو جیسا کہ مناظروں میں ہوتا ہے۔ پندارِ نفس، ضد اور تعصب، (بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴)) نے انہیں اس قابل ہی نہ رہنے دیا کہ وہ اپنے مسلک پر نظرِ ثانی کر سکیں۔ اور ان کی یہی لکیر ان کے متبعین پیٹے جا رہے ہیں۔ (ان میں تو کوئی پڑھا لکھا

آدمی بھی نظر نہیں آتا)۔ ان کا دعوے ان کی زبانی سنیئے۔ کہتے ہیں۔

طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآن میں صرف احکام ہیں اور باستثنا سے چند ان کی تفصیلات اس میں موجود نہیں۔ مگر بلاغ القرآن کا مسلک یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں احکام مع تفصیلات موجود ہیں۔

(بلاغ القرآن۔ فروری ۷۵ء۔ صـ۲۵)

قرآن کا تبیین احکام کا انداز

اس کے بعد آیئے آپ ان کے اس دعوے کی طرف کہ قرآن مجید نے اپنے تمام احکام کی جزئیات خود متعین کر رکھی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ پہلے یہ دیکھئے کہ احکامات کے سلسلہ میں قرآن کریم کا طریق اور انداز کیا ہے۔ اس نے اپنی آیات کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ متشابہات اور محکمات (۳/۷)۔ متشابہات وہ خارجی اور مابعد الطبیعاتی بسیط حقائق ہیں جنہیں اس نے تشبیہاً بیان کیا ہے۔ ان کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ جہاں تک محکمات کا تعلق ہے، یہ قرآنی احکام و قوانین ہیں۔ اور جس طرح احکام و قوانین کی صورت میں ہونا چاہیئے، انہیں اس نے بالکل واضح اور محکم انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اگر کسی ضابطہ قوانین کے احکام واضح شکل میں نہ ہوں تو وہ ضابطہ قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ ان احکام کی یہ شکل نہیں کہ زید ان سے کچھ سمجھے اور بکر کچھ اور۔ دو چار مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

(۱) سورہ نساء کی دو تین آیات میں اس نے ان رشتوں کی تفصیل دی ہے (یعنی وضاحت کی ہے) جن سے نکاح حرام ہے۔ آپ ان رشتوں پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ انہیں کس قدر متعین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس قدر متعین انداز میں کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں) کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۲۲-۲۳)۔ "جن عورتوں سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا تھا، ان سے بھی نکاح نہ کرو"۔ یعنی امہٰتکم (مائیں) سے چونکہ یہ بات واضح نہیں تھی کہ ان میں سوتیلی مائیں بھی شامل ہیں یا نہیں، اس نے اس کی بھی وضاحت کر دی۔ اس وضاحت کی موجودگی میں ہر شخص پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ خدا نے سوتیلی اور حقیقی ماؤں (دونوں) سے نکاح حرام قرار دیا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی کہہ دے کہ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہے اور دوسرا کہہ دے کہ نہیں! قرآن کی رو سے اس سے نکاح جائز ہے۔ یہ ہے محکمات کا انداز۔

(۲) سورہ نساء ہی میں اس نے وراثت کے حصوں کا تعین کیا ہے۔ دیکھئے کہ اس نے کس طرح مختلف وارثوں کے چھوٹے بڑے تمام حصوں کی جزئیات تک کا تعین کر دیا ہے۔ فلاں کا نصف۔ فلاں کا تہائی۔ فلاں کا چھٹا حصہ۔ فلاں کا آٹھواں حصہ وغیرہ۔ یہ ہے قرآن کی رو سے جزئیات کا تعین۔ یعنی جن احکام کی اس نے جزئیات خود متعین کی ہیں، ان جزئیات کی کیفیت یہ ہے۔

(۳) سورۃ بقرہ (۲/۱۸۰) میں اس نے وصیت کا اصولی حکم دیا ہے۔ اس کے بعد سورہ مائدہ میں اس

نے اس طریق کی وضاحت کر دی جس کے مطابق وصیت کو ضبط میں لانا چاہیئے۔ (۵/۱۰۶-۱۰۸)۔ ان آیات میں آپ دیکھئے کہ اس نے اس طریق کی جزئیات کا کس وضاحت سے ذکر کر دیا ہے۔

(۴) سورۂ بقرہ میں اس نے لین دین کے معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ (۲/۲۸۲)۔ ان آیات میں آپ دیکھئے کہ اس نے کس وضاحت سے بتایا ہے کہ اسے کس طرح لکھا جائے۔ کون لکھے۔ کون لکھوائے اس پر کس طرح گواہ مقرر کیے جائیں۔ ان کی شہادت کس طرح قلمبند کی جائے۔ اگر تم حالت سفر میں ہو تو کیا کرو..... یہ جزئیات اس قدر وضاحت سے اور متعین طور پر مذکور ہیں کہ آیت (۲/۲۸۲) قرآن مجید کی (غالباً) سب سے لمبی آیت ہے۔ یہ ہے تعیین و تبیین جزئیات کا قرآنی انداز۔

(۵) اس نے نکاح، طلاق، مہر، عدت وغیرہ سے متعلق احکام دیئے تو دیکھئے ان کی جزئیات کو کس متعین انداز سے بیان کر دیا۔

(۶) اس نے روزوں کے احکام دیئے تو دیکھئے انہیں کس طرح متعین انداز میں بیان کیا ہے — ایک مہینے کے روزے۔ صبح کی سیاہ اور سفید دھاری کے نمایاں ہونے سے لے کر رات تک، کھانے پینے اور جنسی اختلاط کی ممانعت۔ مسافر اور بیمار کی صورت میں التوا جس کے لئے روزہ ناقابلِ برداشت ہو اس کی استثناء۔ یہ تمام جزئیات متعین طور پر بیان کر دیں۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھا کہ جن احکام کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین کر دی ہیں ان میں انسانی قیاس آرائیوں کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ان میں کا ہر حکم واضح اور متعین ہے اور ہر شخص حتمی طور پر کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں خدا نے یہ فرمایا ہے۔ نیز جو کچھ اس نے فرما دیا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی قسم کا تضاد نہیں۔

(۲) اب آگے بڑھیئے۔ قرآن کریم نے اپنے تمام احکام کی جزئیات کا تعین خود نہیں کیا۔ اکثر اصولاً بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں بعض احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات کا تعین قرآن ہی کے دیگر متعلقہ احکام کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں مطلقہ عورت کی عدت کے متعلق کہا گیا ہے کہ عام حالات میں وہ تین حیض ہے۔ (۲/۲۲۸)۔ لیکن اگر وہ حاملہ ہو تو عدت وضعِ حمل تک ہے۔ (۶۵/۴)

بیوہ کے متعلق کہا ہے کہ اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ (۲/۲۳۴)۔ لیکن بیوہ اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کے لئے کہا جائے گا کہ مطلقہ حاملہ کی عدت پر قیاس کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بیوہ حاملہ کی عدت بھی وضعِ حمل تک ہوگی۔ لیکن اس کے متعلق ہم یہ کہنے کے مجاز نہیں ہوں گے کہ یہ عدت خدا کی مقرر کردہ ہے۔ ہم یہی کہہ سکیں گے کہ یہ ہمارا استنباطی اجتہاد ہے۔

(۳) بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کی جزئیات کو بطریقِ استنباط بھی متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً قرآن میں امتِ مسلمہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ ان کے معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ یہاں مشاورت کا اصولی حکم دیا گیا ہے۔ اس کا طریق نہیں بتایا گیا۔ یہ طریق قرآن کریم کی دیگر آیات سے مستنبط بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا طریقِ مشاورت امت خود متعین کرے گی

اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ یہ جزئیات قرآن کریم کے کسی اصول، حکم یا قانون سے ٹکرائیں نہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ جزئیات قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کی جائیں گی۔

اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ ۲ اور ۳ کی صورت میں استنباطِ احکام یا تعیینِ جزئیات کا حق اور اختیار کسی فرد (یا کسی گروہ) کو نہیں دیا جا سکتا، خواہ وہ فرد کتنا ہی بڑا عالم، فقیہہ، یا مجتہد کیوں نہ ہو۔ یہ حق اور اختیار صرف نظامِ مملکت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو حاصل ہوگا۔ وہی نظام ان جزئیات کا تعین کرے گا اور وہی ان میں عندالضرورت تغیر و تبدل کا مجاز ہوگا۔ اس کے فیصلے ساری امت کے لئے واجب العمل ہوں گے کیونکہ ان کی حیثیت قوانینِ حکومت کی ہوگی۔ اس سے امت کی وحدت قائم رہے گی۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں کسی شخص کے اپنے طور پر فیصلے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد بھی اس باب میں اربابِ فکر و نظر کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ امام اعظمؒ کا فقہ میں جو مقام ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مؤرخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایک دن ان کی صاحبزادی نے کہا کہ ابا جان! میں روزہ سے ہوں۔ دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے میں اتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی رہا۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹی! اپنے بھائی حماد سے پوچھو کہ حکومت کی طرف سے فتوے دینے کے مجاز وہ ہیں، میں نہیں۔ ان حضرات کی احتیاط کا یہ عالم تھا۔ اور اب ۔۔۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۔۔۔ جس کا جی چاہا فیصلے کرنے کا مجاز بن بیٹھا۔ مذہب میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

(۰)

اہل قرآن کی جزئیات

ان تصریحات کے بعد، فرقہ اہل قرآن کے مسلک کی طرف آیئے۔ ان کا دعوےٰ یہ ہے کہ تمام احکام کی جزئیات قرآن کریم نے خود ہی متعین کر دی ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک تصریحات بالا میں شق ۲ اور ۳ (اسلامی نظام کی طرف سے استنباطِ احکام اور تعیینِ جزئیات) خلافِ قرآن ہوں گے۔ اس مقام پر ہمارے سامنے ایک دلچسپ حقیقت آتی ہے۔ (مولانا) عبداللہ چکڑالوی نے اپنے ہاں اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاج رسالت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ خالص مذہب کی سطح پر سوچتے تھے اور مذہب میں نظام کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ یکسر انفرادی اور پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ہمارے دور میں، اسلامی نظام کا تصور اجاگر ہوا ۔۔۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا تصور پیش کیا، علامہ اسلم جیراج پوری نے اس کے تشکیلی خطوط کی وضاحت کی اور اس کی عام نشر و اشاعت کی سعادت طلوع اسلام کے حصہ میں آئی۔ دین کا یہ تصور اس قدر معقول، اور اسلام کے آخری اور مکمل دین ہونے کی دلیل اور برہان تھا کہ قدامت پرست مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کے علی الرغم، اربابِ فکر و نظر نے اسے اپنے قلوب سکیم میں جگہ دے دی۔ اس کے بعد محراب و منبر بھی ان اصطلاحات کے اختیار و استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اسی مجبوری کے ماتحت (مولانا) چکڑالوی کے

متبعین کو بھی ان الفاظ کو دہرانا پڑا۔ لیکن اس سے یہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔ اسلامی نظام کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تسلیم کریں کہ جن احکام کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، وہ انہیں اصولِ مشاورت کے مطابق متعین کرے گا۔ اہلِ قرآن کا عقیدہ یہ ہے کہ جملہ احکام کی جزئیات قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ پھر اسلامی نظام کرے گا کیا؟ قرآن نے جو مشاورت کا حکم دیا ہے، اس پر عمل کس طرح سے ہوگا؟ دیکھئے وہ اس کشمکش سے نکلنے کی صورت کیا اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

> آنحضور کو حکم ہوا۔ شاورھم فی الامر (۳/۱۵۹)۔ اور مومنوں کی صفت بیان ہوئی ہے وامرھم شوریٰ بینھم۔ (۴۲/۳۸)۔ دیکھئے! امر میں مشاورت کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کے حکم میں نہیں۔ حکم کے متعلق تو ارشاد ہوا ہے۔ ان الحکم الا للہ۔ (۱۲/۴۰؛ ۶/۵۷) حکم صرف اللہ کا ہے۔ لا یشرک فی حکمہ احدًا (۱۸/۲۶) اللہ اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں کرتا۔ اس لئے حکم اللہ کا اور جزئیات بندوں کی؟ (العیاذ باللہ)
>
> (بلاغ القرآن۔ بابت فروری ۱۹۷۵ء ص ۲۶)

اس کے بعد انہیں یاد آگیا کہ خود لفظ امر کے معنی حکم ہیں۔ اس کا کیا علاج؟ کہا۔

> لفظ امر کا معنی حکم بھی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ کے حکم میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی جزئیات متعین کرنے بیٹھ جائے، کہ نمازیں پانچ پڑھی جائیں یا تین یا دو یا ایک۔ اس لئے شاورھم فی الامر (۳/۱۵۹) امرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸) میں آمدہ لفظ امر سے اللہ کا حکم مراد نہیں بلکہ وہ معاملات مراد ہیں جو آنحضور اور آپ کے جانشینوں کو داخلی یا خارجی معاملات میں وقتاً فوقتاً ہنگامی طور پر پیش آتے تھے۔
>
> (صفحہ ۲۷)

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کی خالص مذہب پرستانہ ذہنیت کس طرح پھوٹ پھوٹ کر سامنے آرہی ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ اور آپ کے صحابہؓ نے حکومتِ خداوندی کو قائم فرمایا تھا اور اس حکومت کے جس قدر معاملات تھے ان سب کا تعلق، "حکم" خداوندی سے تھا۔ اس میں "عبادات" اور "امورِ مملکت" میں کوئی تمیز و تفریق نہیں تھی۔ صحنِ مسجد ہو یا ایوانِ حکومت (بلکہ میدانِ جنگ) ان میں کا ہر معاملہ "حکمِ خداوندی" کے مطابق طے ہوتا تھا۔ "عبادات" اور امورِ مملکت کی ثنویت اور مغایرت اس دور کی پیدا کردہ ہے جب حکومتِ خداوندی کی جگہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے لے لی تھی — اور یہ حضرات (اہلِ قرآن) بھی اسی ذہنیت کے مالک ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اسلام ایک مذہب ہی ہے۔

اور پھر اس پندارِ نفس پر غور کیجئے! اگر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت یہ فیصلہ کرے کہ نمازیں پانچ پڑھی جائیں یا تین یا دو یا ایک "تو یہ شرک ہوگا" اور کوئی عبد اللہ چکڑالوی یا ماسٹر محمد علی رسول نگری یہی طے کرنے بیٹھ جائے تو یہ عین مطابقِ قرآن ہوگا — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا! —

لیکن اتنا لکھنے کے بعد ان کے دل میں خود ہی کھٹک پیدا ہو گئی کہ یہ ہم نے کیا کہہ دیا۔ اس کے ازالہ کے

لئے فرمایا :-

جب خلافتِ الٰہیہ قائم ہوگی وہ قرآن ہی سے فیصلہ دے گی اور اسے قرآنی جزئیات ہی کے نام سے بصمیم قلب تسلیم کرنا ہوگا۔ (بلاغ القرآن۔ فروری ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۹)

سوال یہ ہے کہ کیا وہ (خلافتِ الٰہیہ) نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ "مذہبی امور" اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہوں گے؟ قرآن کریم نے تو ان اربابِ خلافت کے متعلق کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ..... (۲۲/۴۱)۔ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا تو یہ "اقامتِ صلوٰۃ" اور ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے۔ لیکن اگر یہ حضرات اس وقت موجود ہوں گے تو ان سے کہہ دیں گے کہ تمہیں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے متعلق فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دائرہ بھی امورِ مملکت تک محدود ہے۔ تم اگر اس سے تجاوز کرکے مذہبی امور میں دخیل ہوگے تو مملکت کے خلاف بغاوت کی جائے گی۔ کیونکہ تمہارا ایسا کرنا خلافِ قرآن اور شرک ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر مزید تفصیل میں جانا مقصود ہوتا تو میں بتاتا کہ قرآن کریم میں "امر" دین کے معنوں میں آیا ہے۔ اور اسلامی مملکت دین ہی کی مظہر اور ذریعہ نفاذ ہوتی ہے۔ رسول اللہ سے جب کہا گیا تھا کہ ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا..... (۴۵/۱۸)۔ "پھر ہم نے تمہیں امر کے ایک راستے پر لگا دیا۔ سو تم اسی کا اتباع کرو" تو اس سے مراد دینِ خداوندی تھا نہ کہ محض امورِ مملکت۔ دوسری طرف جب جماعتِ مومنین سے استخلاف فی الارض (حکومت و مملکت) کا وعدہ کیا گیا تھا تو اس کی غرض و غایت یہ بتائی گئی تھی کہ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ (۲۴/۵۵)۔ تاکہ اس سے اس دین کو تمکن حاصل ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ لہٰذا امر کو دنیاوی امور تک محدود سمجھنا دین سے بے خبری کی دلیل ہے۔ ان تمام امور کی جزئیات متعین کرنا جن کا تعین قرآن کریم نے نہیں کیا، اسلامی نظام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۵)

قرآن کیخلاف سنگین الزام

اسے پھر دہرا دیا جائے کہ ان لوگوں کا دعوےٰ یہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام احکام کی جزئیات خود ہی متعین کر دی ہیں۔ قرآن کی متعین کردہ جزئیات کی کیفیت کیا ہوتی ہے ۔ وہ کس قدر واضح، صاف اور متعین ہوتی ہیں ۔ اس کی مثالیں پہلے دی جا چکی ہیں۔ یہ اس قدر واضح اور متعین ہوتی ہیں کہ ان کے متعلق دو آراء کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جہاں اس نے کہا ہے کہ "فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ" ۔ (۴/۱۱)۔ یعنی ماں کا چھٹا حصہ ہے تو اسے دو نہیں، دو کروڑ آدمی بھی دیکھیں تو اس کے حصہ کو چھٹا حصہ ہی کہیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ

ایک شخص چھٹا حصہ کہہ رہا ہے اور دوسرا آٹھواں حصہ۔ اس تصریح کے بعد اب نماز کی ان جزئیات کو لیجئے جنہیں ان حضرات کے نزدیک قرآن نے متعین کیا ہے۔ (مولانا) چکڑالوی نے قرآن کریم کی آیات ([illegible]) اور ([illegible]) سے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقتوں کی نماز کا حکم دیا ہے اور بلاغ القرآن والوں نے انہی دو آیتوں کو درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں تین وقتوں کی نماز فرض قرار دی ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ قرآن کا قطعی فیصلہ ہے۔ یا مثلاً مولانا چکڑالوی نے سورۃ النساء کی آیات (۴/۱۰۱-۱۰۲) درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ خدا نے ان میں حکم دیا ہے کہ نماز کی چار رکعتیں ہیں اور بلاغ القرآن نے انہی آیات کے درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ خدا نے نماز کی دو رکعتیں مقرر کی ہیں۔ اسی طرح مولانا چکڑالوی نے کہا ہے کہ خدا نے ایک رکعت میں دو سجدوں کا حکم دیا ہے اور بلاغ القرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ کا حکم دیا ہے۔

سوچئے کہ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ کیا آپ کے خدا کو یہ کہنا بھی نہیں آتا کہ نماز کے کتنے اوقات ہیں، کتنی رکعتیں اور کتنے سجدے۔ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ اگر قرآن کی یہی حالت ہے کہ اس کی ایک ہی آیت سے پانچ وقت اور تین وقت یا چار رکعتیں اور دو رکعتیں۔ یا دو سجدے اور ایک سجدہ ثابت ہو جاتا ہے تو ایسے قرآن کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور قائم ہوگا؟ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا غرض کہ ان کی اس قسم کی حرکتوں سے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور قرآن کریم کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ انہیں تو ایک جدید فرقہ کی تشکیل اور اس کی امامت سے غرض ہے۔ اور بس!

مندرجہ بالا آیات میں تو پھر بھی صلوٰۃ کے الفاظ آتے ہیں لیکن جب ہم ان کے بیان کردہ "اذکارِ صلوٰۃ" کی طرف آتے ہیں تو وہاں اس سے بھی زیادہ حیرت افزا اور تاسف انگیز صورت سامنے آتی ہے۔ سورۂ نمل میں ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا گزر وادیٔ نمل پر سے ہوا اور اس قوم کی سربراہ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاؤ ورنہ سلیمانؑ کا لشکر تمہیں کچل دے گا تو حضرت سلیمانؑ اس کی غلط فہمی پر متبسم ہوئے اور اس کے ساتھ ہی خدا سے دعا کی کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ (۲۷/۱۹)۔ "اے میرے رب! مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ تو نے جس نعمت سے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے، اس کا شکر ادا کروں اور تیری پسند کے مطابق عمل صالح کروں"۔ یہی الفاظ کچھ اضافے کے ساتھ سورۂ احقاف (۴۶/۱۵) میں مومنین کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ ان مقامات میں نہ کہیں صلوٰۃ کا ذکر ہے، نہ رکوع و سجود کا۔ لیکن "بلاغ القرآن" والوں کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو رکوع کی حالت میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ہم نے صرف ایک مثال پیش کی ہے۔ ورنہ انہوں نے دعائے قبل صلوٰۃ سے اذکار بعد صلوٰۃ تک اسی طرح سے مختلف آیتیں درج کی ہیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ ہے قرآن کا مقرر کردہ صلوٰۃ کا طریق۔

اگر یہ حضرات یہ کہتے کہ ہم نے قرآن کریم میں غور و فکر کیا ہے جس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ نماز میں اس قسم کی دعائیں پڑھنی چاہئیں تو یہ اور بات ہوتی۔ لیکن ان کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے کہ نماز میں حالتِ قیام

میں یہ پڑھو، رکوع میں یہ پڑھو اور سجدہ میں یہ کہو۔ اپنے قیاس کو خدا کا حکم کہہ کر پیش کرنا اتنی بڑی جسارت ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں اس کا بھی قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ جب کل کو اللہ تعالیٰ یہ پوچھے گا کہ میں نے کب کہا تھا کہ قیام میں یہ آیتیں پڑھو اور رکوع اور سجدے میں یہ آیتیں تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ قرآنی آیات کے ساتھ اس قسم کا کھیل مرزا غلام احمد کھیلا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ قرآنی آیت — هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله — میں مجھے رسول کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (براہین احمدیہ ص ۴۹۸ و اعجاز احمدی) وقس علیٰ ذالک۔ لیکن وہ تو اپنے اس قسم کے دعاوی کی دلیل اور سند یہ پیش کرتے تھے کہ انہیں اس کی بابت خود خدا نے بذریعہ وحی بتایا ہے۔ معلوم نہیں کہ بلاغ القرآن والوں کے پاس اس کی کیا سند اور حجت ہے کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ تم نماز میں فلاں آیات پڑھا کرو۔ قرآن کریم میں تو ایسا کہیں نہیں آیا۔

چونکہ قارئین طلوعِ اسلام کے دل میں یہ خواہش ابھرے گی کہ وہ کون سی آیات ہیں جن پر ان کی وضع کردہ نماز مشتمل ہے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مقالہ کے آخر میں ان کے بیان کردہ اذکارِ صلوٰۃ درج کر دیئے جائیں۔ قارئین ان آیاتِ قرآنی کو دیکھیں اور پھر سوچیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کسی ایک جگہ بھی یہ کہا ہے کہ انہیں نماز میں یوں پڑھو۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ خدا کی مقرر کردہ جزئیات ہیں، کتنی بڑی جسارت ہے۔ قرآن کریم نے یہودی فقیہوں کے متعلق کہا تھا کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ (۲/۷۹)۔ "وہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے"۔ کیا اسی قبیل کی جسارت ان اہلِ قرآن کی نہیں کہ یہ اپنے ذہن سے تجویز کرتے ہیں کہ فلاں آیات نماز میں پڑھی جانی چاہئیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی تجویز کردہ آیاتِ صلوٰۃ ہیں۔ (معاذ اللہ)

(۰)

فرقہ سازی

قرآن کریم نے بالفاظِ صریح فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱-۳۲) اور متعدد آیات میں اس کی سخت مخالفت کی ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت ان آیات کو لوگوں کے سامنے نہیں لاتی تھی۔ طلوعِ اسلام نے اسے اس شد و مد سے دہرایا اور اس کا اتنا چرچا کیا کہ لوگوں نے مولوی صاحبان سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ان آیات کی موجودگی میں، اسلام میں فرقوں کا کیا جواز ہے؟ اس اعتراض کا کوئی جواب ان سے بن نہیں پڑتا تھا۔ اس سے یہ بڑی تنگی میں تھے کہ کسی وسوسہ انداز نے ان کے کان میں پھونک دیا کہ یہ فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ اس سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ اور یہ تو معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو فریب دے لیا یا نہیں لیکن لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا شروع کر دیا کہ ہمارے ہاں مذہبی فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ عوام بیچارے کو کیا معلوم کہ مکاتبِ فکر کیا ہوتے ہیں اور مذہبی فرقے کیا۔ چنانچہ آجکل اس کا چرچا عام کیا جا رہا ہے اور اس طرح کبوتر آنکھیں بند کر کے مطمئن ہو بیٹھا ہے کہ بلی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

مکاتبِ فکر سے کیا مراد ہے

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے اپنی آیات کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے — متشابہات اور محکمات — آیاتِ متشابہات کا تعلق کائنات اور مابعد الطبیعات کے ان بسیط حقائق سے ہے جنہیں تشبیہی انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ ان حقائق کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی فکر کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فکرِ انسانی، انسانی علوم کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ وسیع اور بلند ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ان آیات میں بیان کردہ حقائق کا مفہوم بھی ہر دور میں وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان حقائق، نیز احکامِ قرآنی کے معارف و مصالح پر اس طرح غور و فکر کرنے والوں کو مفکرین کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے فکری اختلاف کی بنا پر کوئی فرقہ وجود میں نہیں آتا۔ مسلم مفکرین میں ابن باجہ، ابن رشد، ابن سینا، ابن طفیل، ابن مسکویہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہیں کیا۔ ہمارے دور میں سر سیدؒ اور اقبالؒ کا شمار بھی مشہور مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کے مکاتبِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) تو اپنے اپنے ہیں لیکن یہ کسی فرقے کے بانی نہیں ہیں۔

اس کے برعکس فرقہ وجود میں آتا ہے محکمات میں اختلاف کی بنا پر۔ اس میں عقاید کے اختلاف بھی شامل ہیں اور اعمال کے اختلاف بھی۔ یہی وہ فرقہ بندی ہے جسے قرآن نے شرک قرار دیا ہے کہ اس سے امت کی وحدت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ان فرقوں کے نشاناتِ تعارف تو الگ الگ ہیں لیکن یہ محسوس طور پر نکھر کر سامنے آتے ہیں نماز کے وقت۔ مسلمانوں کا دو چار ہزار کا مجمع بھی کسی جگہ ہو، تو آپ پہچان نہیں سکیں گے کہ کون کس فرقے سے متعلق ہے۔ لیکن جونہی نماز کی اذان ہوگی تو یہ الگ الگ ہو کر الگ الگ مسجدوں کا رُخ کر لیں گے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کون کس فرقے سے متعلق ہے۔ مختلف فرقوں کی نمازوں میں بھی فرق ہوتا ہے لیکن تفرقہ کے لئے یہ فرق بھی ضروری نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دو فرقوں کی نماز میں کوئی فرق نہ ہو لیکن اس کے باوجود ان میں بعد المشرقین ہو۔ مثلاً احمدیوں نے اپنی نماز وہی رکھی جو حنفی مسلمان پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی مسجدیں الگ بنائیں۔ نماز میں فرقہ بندی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک فرقہ کے مسلمان دوسرے فرقہ کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے۔ یا یوں کہئے کہ دوسرے فرقہ کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اس لئے ان کی مسجدیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں اور جماعتیں بھی الگ الگ۔ یوں نماز مختلف فرقوں کا تعارفی نشان بن جاتی ہے۔ امت میں تفریق کی جو پہلی اینٹ رکھی گئی تھی وہ مسجد ہی کی اینٹ تھی جسے قرآن نے "مسجدِ ضرار" کہہ کر پکارا اور کفر قرار دیا ہے۔ (۹)

جس طرح باقی مذہبی فرقے، فرقے کے نام سے تلملا اٹھتے ہیں، اسی طرح اہلِ قرآن کے لئے بھی یہ لفظ آتش بہ پیرہن ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ ہم فرقہ نہیں۔ چنانچہ بلاغ القرآن نے اپنی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۵ء میں لکھا ہے کہ

طلوعِ اسلام نے جنوری ۱۹۷۵ء کے صفحہ ۴۸ پر عنوان قائم کیا ہے۔ فرقہ اہلِ قرآن۔

اور وہ ہمیں فرقہ کہتے کہتے تھکتا نہیں۔ حالانکہ ہم بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم فرقہ نہیں ہیں۔
(صفحہ ۲۲)

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

اگر طلوع اسلام الگ درسوں، الگ کنونشنوں، الگ اسٹیجوں اور الگ بزموں کے باوجود فرقہ نہیں تو بلاغ القرآن صرف قرآن کی فرض کی ہوئی نماز کی ادائیگی کی بدولت فرقہ کس طرح ہو گیا۔

(بلاغ القرآن۔ بابت دسمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۰)

نماز کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز فرقہ بندی سکھاتی ہے۔ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں انہیں غلطی لگ چکی ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی عقائد کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہے، نماز سے نہیں۔

(پمفلٹ۔ الصلوٰۃ۔ صفحہ ۱۵-۱۴)

یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کون کہتا ہے کہ نماز فرقہ بندی سکھاتی ہے لیکن 'جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' ہر فرقہ نماز کی علیحدگی سے پہچانا جاتا ہے۔ یعنی فرقے کی پہچان یہ ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر یا ان کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ اسی لئے ان کی جماعت بھی الگ ہوتی ہے اور مسجدیں بھی الگ۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا اہل قرآن کی نماز کی صورت یہی نہیں کہ وہ نہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے ہیں نہ کسی دوسرے امام کے پیچھے۔ کیا اسی بنا پر انہوں نے اپنی مسجد الگ نہیں بنائی اور کیا اس میں اسی فرقہ کے لوگوں پر مشتمل الگ نماز کی جماعت نہیں ہوتی۔ اگر یہ فرقہ بندی نہیں تو پھر کیا فرقوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ نماز میں علیحدگی کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) اہل حدیث اور حنفی فرقوں کی نمازوں میں اختلاف ہے لیکن وہ اختلاف ایسا معمولی سا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یا دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن فرقہ اہل قرآن کی نماز کی یہ کیفیت ہے کہ وہ دعائے قبل الصلوٰۃ سے لے کر آخری سلام تک تمام مسلمانوں کی نمازوں سے یکسر مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے (اور اس مقالہ کے آخر میں آپ دیکھیں گے) سورۃ فاتحہ کے سوا، ان کی نماز اور دوسرے مسلمانوں کی نماز میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ حتیٰ کہ ان کی نماز جنازہ بھی الگ ہے۔ یہ عجیب دلچسپ بات ہے کہ مسلمانوں میں پہلا فرقہ اہل تشیع کا وجود میں آیا۔ ان کی نماز، دوسرے مسلمانوں کی نماز سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ اگر چاہیں بھی تو آپس میں مل کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے[1] اور اس کے بعد اب (سر دست) آخری فرقہ اہل قرآن کا وجود میں آیا۔ یہی

---

[1] ان کی نماز اور دیگر مسلمانوں کی نماز میں سورۃ فاتحہ۔ اس کے بعد کوئی سی قرآنی سورۃ اور رکوع و سجود کی تسبیحات (تھوڑے سے فرق کے ساتھ) مشترک ہیں۔ باقی جزئیات اس قدر مختلف ہیں کہ شیعہ اور غیر شیعہ اکٹھے نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔

کیفیت ان کی نماز کی ہے۔ یہ اگر چاہیں بھی تو دوسروں کے ساتھ مل کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ نہ ہی کوئی دوسرا ان کی نماز میں شریک ہو سکتا ہے۔ کیفیت ان کی یہ ہے اور اس کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ ہم الگ فرقہ نہیں۔ یہ بعینہٖ وہی شکل ہے جو "احمدیوں" نے اختیار کر رکھی تھی اور قریب سو برس سے کہتے چلے آ رہے تھے کہ ہم مسلمانوں سے الگ نہیں ہیں۔ "بلاغ القرآن" والے بار بار طلوعِ اسلام کا ذکر کر کے لوگوں

طلوعِ اسلام کا ذکر

کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ ان پر واضح ہونا چاہیئے کہ طلوعِ اسلام الگ اسٹیجوں، الگ بزموں، الگ کنونشنوں اور الگ درسوں کے باوجود کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے نماز روزہ وغیرہ میں کوئی نیا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ یہ خالص فکری تحریک ہے۔ اس لئے اس میں فرقہ بندی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے درسوں، بزموں، کنونشنوں میں ہر فرقہ کے مسلمان شامل ہوتے ہیں اور اپنے اپنے طریقہ پر ارکانِ اسلام کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس باب میں اس کی شدتِ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ یہ اپنے اجتماعات میں نماز باجماعت کا کوئی اہتمام نہیں کرتا اور ان میں شامل ہونے والوں سے تاکیداً کہتا ہے کہ وہ آس پاس کی مسجدوں میں جا کر نماز پڑھیں۔ وہ ڈرتا ہے کہ آج کا نماز کا الگ اہتمام کل کو کہیں امت سے علیحدگی کا نشان نہ قرار پا جائے[1]۔

(۰)

ملخص

داستان دراز ہو گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس فرقہ نے قرآن کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے عقیدہ اور عمل کی رُو سے :-

(۱) قرآن کریم کا یہ دعوٰے ہی باطل قرار پا جاتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور جب اس کا یہ دعوٰے باطل قرار پا جائے تو وہ خود اپنے بیان کے مطابق منزّل من اللہ رہتا ہی نہیں۔

(۲) قرآن کا دعوٰے ہے کہ وہ نہایت واضح اور روشن کتاب ہے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں، التباس نہیں، ریب نہیں، تشکیک نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے جس شکل میں قرآن کو پیش کیا ہے اس سے اس کے یہ تمام دعاوی باطل قرار پا جاتے ہیں۔

(۳) ان سے پہلے کسی فرقہ کے بانی نے بھی اپنے قیاس، اجتہاد یا استنباط کے متعلق یہ نہیں کہا تھا کہ وہ خدا کے ارشادات ہیں (بجز مدعیانِ نبوت کے)۔ لیکن ان کی صورت یہ ہے کہ یہ اپنے ذہن سے ایک بات تجویز کرتے ہیں، وَ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ - اور کہتے یہ ہیں کہ وہ خدا کا حکم اور قرآن کا فیصلہ ہے۔

---

[1] ہم نے اس گفتگو کو ان لوگوں کی (بزعمِ خویش) نماز سے متعلق "قرآنی تفصیلات" تک محدود رکھا ہے۔ اسی سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے دیگر احکام کی جزئیات کے متعلق بھی کیا کچھ نہیں گل کھلائے ہوں گے۔

(۴) انہوں نے ایک ایسی نماز ایجاد کی ہے جس میں کوئی دوسرا مسلمان ان کے ساتھ شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ یہ فرقہ بندی کی شدید ترین شکل ہے۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ قرآن اور ملت کے خلاف اس سے بڑی دشمنی کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ اس دور میں قرآنی روشنی بہت دور تک پھیل جاتی اگر یہ لوگ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے نہ ہو جاتے۔

میرا نظریہ اور مسلک

آخر میں، میں اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق ان امور کے متعلق کیا سمجھا ہے۔ واضح رہے کہ میں نے اپنے فہم قرآن کو کبھی حرفِ آخر قرار دیا ہے نہ سہو و خطا سے منزہ۔ میں نے نہ کوئی الگ فرقہ قائم کیا ہے نہ ہی میں کسی فرقے سے متعلق ہوں۔ نہ ہی میرا، قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے سوا کوئی اور دعوے ہے۔ جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں اور جس کی میں تبلیغ کرتا چلا آرہا ہوں وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات ہے۔ اس بنا پر یہ خدا کی طرف سے آخری کتاب اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔

(۲) قرآن کریم میں احکام و قوانین کے علاوہ کائناتی حقائق بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان حقائق اور احکام قرآنی کے مصالح کو ہر فرد اپنے غور و فکر کی رو سے سمجھ سکتا ہے۔ مختلف افراد اور مختلف زمانوں میں اس فکر میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کی وجہ سے امت میں کوئی تفریق نہیں پیدا ہونی چاہیئے۔

(۳) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے انہیں اس نے نہایت واضح اور محکم انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ان میں نہ کسی قسم کا اختلاف اور تضاد ہے نہ ابہام و التباس۔

(۴) ان احکام میں بعض ایسے ہیں جن کی جزئیات تک بھی قرآن نے خود متعین کر دی ہیں۔ یہ جزئیات بھی نہایت واضح، روشن اور غیر مبہم ہیں۔ دوسرے احکام ایسے ہیں جنہیں اصولی طور پر دیا گیا ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ ان کی جزئیات اسلامی نظامِ مملکت خود متعین کرے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآن کے کسی اصول، حکم یا تعلیم سے ٹکراتی نہیں۔ ان جزئیات میں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ عند الضرورت تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کا تعین ہو یا تغیر و تبدل، اس کا اختیار صرف اسلامی نظام کو حاصل ہے، کسی فرد یا کسی گروہ کو نہیں۔

(۵) ان جزئیات کو سب سے پہلے نظامِ اسلامی نے 'عہد رسالتمآبؐ و خلافتِ راشدہ' میں متعین کیا۔

امت کی بدقسمتی سے یہ نظام کچھ عرصہ کے بعد باقی نہ رہا اور اس طرح امت کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ اور دین مذہب میں بدل گیا۔ اس زمانے میں بعض حضرات کی ذاتی کوششوں کی بنا پر صدرِ اول کے ان فیصلوں کو زبانی روایات کی رو سے جمع اور مرتب کیا گیا۔ انہیں روایات کے مجموعے کہا جاتا ہے۔

(۶) ان مجموعوں میں وضعی روایات بھی شامل ہو گئی ہیں۔ میرے نزدیک ان کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو روایات کسی شکل میں بھی قرآن کریم سے ٹکراتی ہیں، ان کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں۔ انہیں حضورؐ یا صحابہؓ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے جو اقوال و اعمال قرآن سے نہ ٹکرائیں، انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ میں احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر نہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جو روایات قرآن کے خلاف ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت غلط ہے۔ وہ حضورؐ کے ارشادات ہو نہیں سکتے۔

(۷) مسلمانوں میں اس وقت متعدد فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اور یہ صورت قرآن کے خلاف اور دین کے منافی ہے۔ قرآن کا تصور وحدتِ امت کا ہے۔ لیکن امت میں وحدت صرف اسلامی نظام کے ذریعے پیدا ہو سکتی ہے۔ لہذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ نظام پھر سے متشکل ہو جائے۔

(۸) یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب تک وہ نظام قائم نہ ہو ہم کیا کریں۔ اس سلسلہ میں میرا نظریہ اور مسلک یہ ہے کہ مختلف فرقے جس جس طریق سے ارکانِ اسلام کی پابندی کرتے چلے آ رہے ہیں، ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ نہ ان میں کوئی تبدیلی تجویز کی جائے اور نہ کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ ایسا کرنے سے بجز اس کے کہ امت میں مزید انتشار پیدا ہو کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اس قسم کا اختیار صرف اسلامی نظام کو حاصل ہے، کسی فرد یا فرقے کو حاصل نہیں۔ اپنے اس نظریہ کے مطابق میں خود بھی ارکانِ اسلام کی پابندی دوسرے مسلمانوں کی طرح کرتا ہوں۔ اور جو لوگ میری بات سنتے ہیں ان سے بھی یہی تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان کی پابندی اسی طریق سے کرتے چلے جائیں۔ البتہ جو عقاید یا شعائر قرآن کے خلاف نظر آئیں ان کی نشاندہی کی جائے اور ان کی جگہ قرآن کی صحیح تعلیم کو عام کیا جائے۔ میں قریب چالیس سال سے یہی کچھ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ اور یہی تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

(۹) تحفظ ناموسِ رسالتؐ میرے ایمان کا جزو اور قرآن کریم کے بلند و بالا و منفرد مقام کا عام کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔ جہاں ان پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے، اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق اس کی مدافعت کی کوشش کرتا ہوں۔ "احمدیوں" اور فرقہ اہلِ قرآن کے خلاف میری جد و جہد کا جذبۂ محرکہ بھی یہی ہے اور مقصود و منتہیٰ بھی یہی۔ میری کسی سے نہ ذاتی دشمنی ہے نہ جذبۂ انتقام۔ اسی لئے میں ان بحثوں میں ذاتیات پر نہیں اترا کرتا۔

(۱۰) آخر میں، میں اسے پھر دہرا دوں کہ امت میں دین کے قیام کی صورت قرآنی نظام کے قیام کے سوا کچھ نہیں۔ وہی امت میں وحدت پیدا کرے گا اور اسے ایک طریق پر چلائے گا۔ امت کا موجودہ انتشار، گروہ سازیاں اور فرقہ بندیاں، نئے نئے اختلافات کی نمود، نئی نئی نمازوں کی اختراع، اردو میں نماز، یہ سب اس لئے ہے کہ امت میں قرآنی نظام باقی نہیں رہا۔ وہ نظام قائم ہو گیا تو یہ سب افتراق و انتشار ختم ہو جائے گا۔

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے!

(۰)

تتمّہ

فرقہ اہل قرآن کی نماز

(۱) تین وقتوں کی نماز۔ اذان کی ضرورت نہیں۔ اللہ اکبر کہنا خلاف قرآن ہے۔
(۲) ایک نماز میں دو رکعتیں
(۳) ایک رکعت میں ایک سجدہ۔
(۴) اذکارِ صلوٰۃ۔ (جو ان کے شائع کردہ پمفلٹ الصلوٰۃ میں درج ہیں)۔

دعائے قبل صلوٰۃ معہ تکبیر صلوٰۃ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝

اذکارِ قیام

اسمائے حسنیٰ اور تسبیح | هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

حمد، استعانت و استغفار | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ

الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۝ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۝ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ۝ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ۝ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ۝ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدتَّهُمْ وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۚ وَمَن تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

اذکارِ رکوع انابت الی اللہ

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اذکارِ سجدہ۔ تسبیح اور حمد

سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُن لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ ۔ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ۝

اذکار بعد الصلوٰۃ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

رسولوں پر سلام سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

حاضر مومنوں پر سلام سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

صلوٰۃ میت کے اذکار رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۵۹/۱۰)

طلوعِ اسلام۔ ان لوگوں سے صرف اتنا پوچھیے کہ ان میں سے کسی ایک ذکر کے متعلق بھی خدا نے کہا ہے کہ اسے نماز کے قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ میں پڑھا جائے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کہا تو آپ کس طرح کہتے ہیں کہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے! یہ خدائی اختیارات کا حامل بن جانا نہیں تو اور کیا ہے!

لیکن ان لوگوں سے قطع نظر، ہم ان سادہ لوح مسلمانوں سے، جو ان کے اس چکر میں پھنس کر ان کی تجویز کردہ نماز کو خدا کی مقرر کردہ صلوٰۃ سمجھنے لگے ہیں، دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے کبھی سوچا بھی کہ آپ کو ان لوگوں نے کس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آپ دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان ہی نہیں، آپ دنیا کے کسی ملک میں، کسی مسجد میں بھی مسلمانوں کی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتے۔ حتےٰ کہ حریم کعبہ میں بھی ان کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ کیونکہ آپ کی نماز ہی دنیا جہان سے نرالی ہے۔ حتےٰ کہ آپ نماز جنازہ تک میں باقی مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

سوچیے کہ انہوں نے کس چابکدستی سے آپ کا رشتہ ساری امت سے منقطع کر دیا ہے جو نماز مجموعہ مسلمان پڑھتے ہیں، وہ کونسی کافرانہ اور مشرکانہ ہے جو انہوں نے آپ کو یہ پٹی پڑھا کر پوری ملت سے الگ کر رکھ دیا! ہمارے زمانے میں احمدیوں نے اپنا رشتہ مسلمانوں سے منقطع کیا تھا۔ لیکن انہوں نے

مسلمانوں سے کٹ کر اپنی الگ امت بنالی، سوچیئے کہ آپ مسلمانوں سے الگ ہو کر کیا کریں گے؟ لہٰذا، میری آپ سے دردبھری پکار یہ ہے کہ آپ اپنی حالت پر نظرثانی کریں۔ اللہ کے حضور اپنے اس جرمِ عظیم کی معافی مانگیں (کہ اس کے ہاں تفرقہ شرک ہے اور شرک ظلمِ عظیم) اور شیرازۂ ملت سے پیوستہ رہیں۔ اس کی اولین علامت نماز میں شرکت ہے۔ جس فرقہ کی نماز بھی آپ کو آتی ہے اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھیں۔ اور دیگر فرقوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہ سمجھیں۔ یہی سلامتی کی راہ ہے۔

میں نے یہ مقالہ آپ احباب کی خیرخواہی کے لیے لکھا ہے، ورنہ بلاغ القرآن سے کسی بحث میں الجھنے کی نہ مجھے فرصت ہے، نہ ضرورت۔

والسلام

پرویز

شاہکارِ رسالت ﷺ — عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ

(اپنے انداز کی منفرد کتاب)

اکثر سوالات الجھتے ہیں کہ:-

★ اسلام کا معاشرتی، تمدنی، عسکری، سیاسی، معاشی نظام کیا ہے؟
★ کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا؟
★ اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:-

★ اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
★ وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
★ عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
★ اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا، جو مفکرِ قرآن جناب پرویز کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

★ نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ، مضبوط جلد۔ جاذبِ نگاہ گرد پوش

قیمت ۱۰/۵۰ روپے (علاوہ محصولڈاک)

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قرآن مجید سمجھ میں نہیں آسکتا

- ترجموں سے کیونکہ قرآنی الفاظ کے مرادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے
- تفسیروں سے کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر مفسروں کے اپنے خیالات اور معتقدات قرآنی مطالب پر غالب آجاتے ہیں۔
- قرآن مجید اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون کی مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے

مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے چالیس سال کی محنت شاقہ سے پہلے اس قسم کا ایک لغات مرتب کیا اور اسکے بعد پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے متعین کیا ـــــ جو

مفہوم القرآن

کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

- مفہوم القرآن (مع متن) موتیوں کی طرح ترشے ہوئے نستعلیق میں بلاکس کے ذریعے عمدہ سفید دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور تین نہایت مضبوط خوبصورت سنہری جلدوں پر مشتمل ہے ضخامت پندرہ سو صفحات۔
- قیمت: جلد اوّل پینتیس روپے، جلد دوم پینتیس روپے، جلد سوم چالیس روپے، مکمل ایک سو دس روپے

ملنے کا پتہ:

ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

مکتبہ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور